جلد ۸۲ فروری ۱۹۷۵ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۲	فروری ۱۹۷۵ء مطابق محرم ۱۳۹۵ھ	عدد ٦

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

زر سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر : محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گذشتہ ماہ شامِ ہمدرد کے زیرِ اہتمام ایک علمی تقریب میں ملک کے ایک نامور جج کی زیرِ صدارت سابق قاضی القضاۃ مغربی پاکستان نے "قرآن کا تصورِ ریاست" کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا۔ یہ مقالہ اعلیٰ طباعتی معیار کے ساتھ شائع ہوا ہے اور اسے بعض روایات کے مطابق انتہائی سرگرمی کے ساتھ ایک خاص مقصد کے تحت پھیلایا جارہا ہے۔ صاحبِ مقالہ نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ہمیں یہ مژدۂ جانفزا بھی سنایا ہے کہ شامِ ہمدرد کی محفلیں سجانے والے حکیم محمد سعید صاحب اس طرح کے دیگر عنوانات کے تحت ذی علم حضرات کو مقالات پیش کرنے کی دعوت دے رہے ہیں جن میں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے کہ جو بات بھی کی جائے وہ "خالص قرآنی نقطہ نظر" سے کی جائے۔

ہم اس فاضلانہ مقالے کے مندرجات پر کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلم قوم کے اندر یہ رجحان ہی بڑا خطرناک ہے کہ اس کے اہلِ علم سنت سے بے نیاز ہو کر صرف قرآن کی روشنی میں اپنے مسائل حل کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی یہ روشنی جس مقدس ذریعے سے ان تک پہنچی ہے اسی مقدس ذریعے سے ملت کو وہ روشنی بھی ملی ہے جسے سنتِ رسولؐ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جس کی مدد سے ایک انسان قرآن کی روشنی سے صحیح طور پر فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ قرآن کی روشنی بلاشبہ ایک نہایت ہی پاکیزہ آسمانی روشنی ہے لیکن اس پاکیزہ روشنی کو زمین پر لانے اور پھر اس روشنی کی مدد سے خدا کے منشا کے مطابق دنیوی اور اخروی مسائل کو صحیح طور پر حل کرنے میں ہمیں سنتِ رسولؐ ہی سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اگر تنہا یہ "آسمانی روشنی" ہی کافی ہوتی، تو اس نور کے پھیلانے اور اس سے کما حقہٗ فائدہ اُٹھانے کے لیے کسی پیغمبر کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک اعلیٰ درجے کا چھاپہ خانہ درکار تھا جس کے ذریعے یہ "کتابِ ہدایت" ہر قسم کے "اغلاط سے پاک" پوری دنیا میں پھیلا دی جاتی اور دنیا

کے اصحابِ علم و دانش اور ماہرینِ قانون اس سے اپنی بساط کے مطابق احکام اخذ کرتے۔ سنّت سے بے نیاز قرآن کے "شیدائیوں" کے جس قدر "اجتہادات" بھی ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے امّت نے گمراہی سمجھ کر مسترد نہ کر دیا ہو۔ جسٹس قدیرالدین صاحب نے اپنے مقالے میں دو مسلم مفکرین کی دینی بصیرت اور ان کے "اجتہادی کارناموں" کو امّت کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے انہیں زبردست دادِ تحسین دی ہے۔ ان میں سے ایک مفکر جناب جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان ہیں۔ جنہوں نے اپنی کتاب "اسلام میں ارتداد کی سزا" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دینِ حق کے اندر مرتد کو قتل کرنے کی جو سزا رکھی گئی ہے وہ صحیح نہیں۔ دوسرے مفکر سید یعقوب شاہ صاحب ہیں جنہوں نے اپنی تصنیف "چند معاشی مسائل اور اسلام" میں کاروباری ضرورتوں کے لیے قرضوں اور بنکوں میں جمع کردہ رقوم پر سود کو حلال و طیّب ثابت کرنے پر پورا زور صرف کیا ہے۔ جو مفکر "اجتہادات" کے ان نوادر کو اپنے سامنے بطور نمونہ رکھ کر قرآن کی روشنی میں اسلام کے تصورِ ریاست کی وضاحت کرنے کی کوشش کرے اس کی توضیحات اگر پریشان فکری اور پریشان نظری کا شاہکار نہیں تو اور کیا ہوں گی۔

جسٹس صاحب کا طرزِ استدلال بالکل وہی ہے جو عام طور پر غیر مسلم مستشرقین اور مسلمان متغربین اختیار کرتے ہیں کہ پہلے وقت کے تقاضوں کے بارے میں یہ خیال ذہنوں میں راسخ کرنے کی کوشش کی جائے کہ یہ فطرت کے ایسے اٹل ضابطے ہیں جن کے اندر کوئی تغیر ممکن نہیں اور انسان انہیں جوں کا توں قبول کرنے پر اسی طرح مجبور ہے جس طرح کہ قوانینِ قدرت کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ پھر جب مسلمان ان کی یہ بات اچھی طرح گرہ میں باندھ لیں اور نہ صرف حالات کے تقاضوں کی بالادستی بلکہ ان کی قطعی حیثیت کو بھی تسلیم کر لیں تو اس کے بعد انہیں یہ بات سمجھائی جائے کہ اگر عصری تقاضوں میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی تو ان سے الگ رہنا یا ان سے ٹکرا کر سر پھوڑنا کہاں کی دانائی اور خدمت ملی ہے۔ کیا ہوشمندی کا تقاضا یہ نہیں کہ احکامِ شریعت میں ایسی تبدیلیاں پیدا کی جائیں جن سے عصری تقاضوں کے ساتھ سازگاری پیدا ہو سکے؟

فاضل مقالہ نگار جس منطق کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ بڑی دلچسپ ہے۔ ان کے نزدیک کسی چیز کا عملاً وجود ہی اس کے صحیح اور برحق ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ارشاد یہ ہے کہ چونکہ موجودہ دور کی چالیس مسلم ریاستوں میں سے کسی ایک کو بھی صحیح معنوں میں اسلامی ریاست نہیں کہا جا سکتا اس سے یہ

ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کا قیام ممکن نہیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو ان مسلمان مملکتوں کے سربراہ اسے نافذ کرنے سے آخر کیوں گریز کرتے؟ یہ لوگ کافر تو نہیں، مسلمان ہی ہیں۔ ان میں اچھی خاصی تعداد نہایت ذہین افراد پر مشتمل ہے۔ اس حقیقت کا ذکر کرنے کے بعد مقالہ نگار ان کے اس اسلام گریز طرز عمل کی یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں۔

"یہ لوگ عملی انسان ہیں جنہیں مسائل کا سامنا کر کے ان کے حل تلاش کرنا ہیں۔ وہ اپنے موجودہ طرز عمل کو اس وقت تک ترک نہیں کر سکتے جب تک کہ انہیں اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ اگر وہ اسلام کے تابع فرمان بن جائیں تو اجتماعی معاملات بخوبی طے ہوتے چلے جائیں گے۔ اگر ہم ان حضرات کو قائل یا ان کے انداز فکر کو تبدیل کرنے سے قاصر ہیں تو ان کمزور افراد کی تائید و حمایت کا کیا فائدہ جو نہ تو معاملات کی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں اور نہ قوم کی سربراہی کا منصب سنبھال سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ لوگ ہماری قیمتی عددی قوت تو ہیں مگر یہ اہم مسائل کو منفی انداز میں حل کرنے کے عادی ہیں، اور ہمیں تعمیری انداز فکر کی ضرورت ہے۔ یعنی اختصاصی علم اور دنیوی معاملات کا تجربہ۔"[۳۶]

ہم یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہتے ہیں کہ گذشتہ سالوں میں نہ صرف ہمارا اخلاق بگڑا ہے بلکہ سوچنے سمجھنے کا معیار بھی کافی حد تک پست ہوا ہے۔ ملک کے ایک نامور صاحب علم لادینیت کے حق میں اس طرح کی بھونڈی دلیلیں پیش کر کے اپنے موقف کی صحت تسلیم کروانے پر مصر نظر آتے ہیں۔ اگر ہم فاضل مقالہ نگار کی یہ بات تسلیم کر لیں کہ کسی چیز کا موجود ہونا ہی اس کے برحق ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور کسی چیز کی غیر موجودگی اس کے ناممکن العمل ہونے کی زبردست شہادت تو اس سے تو دنیا میں خیر اور بھلائی کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ہم جسٹس صاحب کی خدمت میں بصد احترام عرض کرتے ہیں کہ دنیا میں عدل و انصاف کا جو نظام قائم ہے کیا اس کی بساط اس لیے لپیٹ دی جائے کہ یہاں مثالی انصاف عنقا ہے؟ کیا جمہوریت اور جمہوری اداروں کو اس لیے دفن کر دیا جائے کہ آج تک دنیا میں مثالی جمہوریت کبھی قائم نہیں ہوئی؟ کیا ظلم و استبداد کے خلاف اس وجہ سے جدوجہد ترک کر دی جائے کہ پوری دنیا میں صلح و آشتی کی مکمل عملداری کا کوئی نشان نہیں ملتا؟ بلند مقاصد اور ارفع نصب العین تو ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ ایک طرف تو لوگوں کی صحیح سمت پر راہنمائی کریں اور دوسری طرف ان کے اندر ان کے حصول کی

آرزو اور تڑپ پیدا کر کے انہیں تعمیری راہ پر گامزن رکھیں۔

اگر جناب قدیر الدین صاحب کی منطق کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اسلامی ریاست کے قیام کے مقدس نصب العین کو محض اس بنا پر چھوڑ دیا جائے کہ دنیا کی چالیس مسلم ریاستوں میں سے کوئی ایک ریاست بھی اسلامی نظام کا صحیح نقشہ پیش نہیں کرتی تو پھر ہمیں اس منطق کی رُو سے صرف اسی ایک مقصد سے ہی دست بردار نہ ہونا پڑے گا بلکہ زندگی کی ساری ارفع و اعلیٰ اقدار کو بھی تیاگ دینا ہوگا، کیونکہ انسانوں کی عظیم اکثریت اُن سے عاری ہے۔ اگر کسی چیز کا وجود ہی اس کے صحیح ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے تو پھر کفر و الحاد، ظلم و استبداد، ناانصافی اور زیردست آزاری، اخلاقی بے راہ روی اور مکر و فریب جیسے معائب کے خلاف صف آرا ہونے کے بجائے انہیں صحیح اور برحق سمجھ کر سینے سے لگانا چاہیے۔ کیونکہ آج کی دنیا میں انہیں غلبہ حاصل ہے اور ان مذموم صفات کے مقابلے میں جتنی اعلیٰ صفات کا تصور کیا جاسکتا ہے انہیں باطل سمجھ کر اپنے دل و دماغ سے محو کر دینا چاہیے کیونکہ ان سے متصف ہونے والے افراد انسانی معاشرے میں کسی نمایاں حیثیت کے حامل نہیں اور ان کی تعداد بھی نہایت ہی قلیل ہے۔

پھر فاضل مقالہ نگار کے ذہن میں یہ بات بھی رہنی چاہیے کہ اسلامی ریاست کے قیام کا نصب العین کوئی ایسا نصب العین نہیں جس پر کسی طرح سے "پیکر خیال" ہونے کا اطلاق ہوسکتا ہو۔ یہ ایک ایسا ممکن الحصول نصب العین ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں باقاعدہ حاصل کر کے پوری دُنیا کو اس کا عملی نمونہ دکھایا گیا اور جس کی پوری تفصیلات کا مستند ریکارڈ آج تک موجود ہے۔ پھر حضورؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ربع صدی تک یہ نظام اپنی فطری آب و تاب کے ساتھ یہاں موجود رہا۔ اور اس کے بعد بھی متعدد ادوار ایسے آئے جن میں یہ نظام باقاعدہ قائم ہوا اور بڑی کامیابی کے ساتھ نہ صرف امور مملکت بلکہ سارے اجتماعی مسائل بھی اسی کے مطابق حل کیے جاتے رہے۔ اگر اس نظام کی مدت عملداری کا جائزہ لیا جائے تو یہ بلا مبالغہ صدیوں پر محیط ہے۔ اس نظام کے مقابلے میں دنیا کا کوئی ایک نظام بھی ایسا نہیں جس کے علمبردار اس بات کا دعویٰ کر سکیں کہ ان کا دلپسند نظام اپنی مثالی صورت میں دنیا کے کسی خطے میں ایک ثانیہ کے لیے بھی قائم ہوا ہے۔ کیا جمہوریت کے داعی مثالی جمہوریت کی کوئی ایک مثال پیش کر سکتے ہیں یا اشتراکی ممالک میں سے کسی ایک ملک کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اشتراکی نظام اپنی مثالی شکل میں

وہاں قائم ہے۔ ریاست اور طبقات کا وجود اشتراکیت کی عین ضد ہے لیکن سارے اشتراکی ممالک میں ریاست کی ظالمانہ جکڑ بندیاں بھی ہیں اور طبقات کی قہرمانیاں بھی اور یہ دونوں اشتراکیت دشمن ادارے تحلیل ہونے کے بجائے دن بدن قوت وطاقت حاصل کرتے جارہے ہیں لیکن اس کے باوجود کوئی اشتراکی یہ بات تسلیم کرنے پہ اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتا کہ ریاست اور طبقات کے بغیر انسانیت کی اجتماعی شیرازہ بندی کا تصور محض کسی دیوانے کا خواب ہے۔ اس نوعیت کی جسارت ایک "مسلمان دانشور" ہی کرسکتا ہے کہ وہ اہل علم کے ایک بڑے اجتماع میں ایک ایسے نظامِ حیات کو ناممکن العمل قرار دے کر مسترد کرنے کی دعوت دے یا اس طرح کی حماقت کرنے والوں کی تائید کرے جس کی حیات آفرین شعاعوں نے اس خطۂ ارضی کے ایک بہت بڑے حصے کو صدیوں تک منور رکھا۔

واجب الاحترام مقالہ نگار کو یہ فکر بڑی شدّت سے لاحق ہے کہ جب مسلم قوم کے "دانشور" جو حکمرانی کے منصب پر بھی فائز ہیں، اسلام کو نافذ کرنے سے گریز کررہے ہیں تو اس نظام کے اندر ضرور کوئی ایسی خرابی موجود ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اس کے خلاف یہ معاندانہ طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اگر انہیں اس بات پر شرح صدر حاصل ہوجائے کہ اس نظام کے قیام سے مسلم قوم کے اجتماعی مسائل لبطریق احسن حل ہوتے چلے جائیں گے تو انہیں اس کے قیام کی راہ میں مزاحم ہونے کی آخر کیا ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ہم جسٹس صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں" دشواریوں کا تذکرہ" تو بعد کی باتیں ہیں ایسے" دانشوروں" کو جنہیں اس بات پر شرحِ صدر حاصل نہیں کہ اگر کافرانہ نظام کو ہٹا کر اسلامی نظام قائم کردیا جائے تو امّتِ مسلمہ کے اجتماعی مسائل بخوبی حل ہوسکیں گے پہلے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے کیونکہ ایمان تو نام ہی اس یقین کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی صورت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے انسانیت کو جو ضابطۂ حیات عطا کیا ہے وہی انسانی مسائل کا صحیح حل اور انسانیت کے دکھوں کا حقیقی مداوا ہے۔ جن "دانشوروں" کو اس حقیقت ہی میں شک ہے انہیں اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی اور تعلق خاطر پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ قرآن مجید میں ایک مومن کی سب سے بڑی نشانی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ جب بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کا کوئی حکم سنتا ہے تو اس کے سامنے فوراً سرِ تسلیم خم کرلیتا ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۔

ایمان لانے والوں کا تو کام ہی یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف بُلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی ۔

(النور - ۵۱)

اسی حقیقت کو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے ۔

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا ۔

اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھا جو اللہ کے رب ہونے پر اور اسلام کے ضابطہ حیات ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہوا۔

جن لوگوں کو ابھی اس بات پر شرح صدر حاصل نہیں ہوا کہ اسلام ہی خدا کا واحد پسندیدہ دین ہے انہیں اپنے اس " تشکک " کا دقت نظر سے جائزہ لے کر یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دینی اعتبار سے کس مقام پر کھڑے ہیں۔

" دانشوروں " کے اس موقف کے بارے میں خود مقالہ نگار کو بھی سوچنا چاہیے کہ اس میں کتنے منطقی مغالطے پائے جاتے ہیں ۔ انہوں نے یہ کیونکر فرض کر لیا ہے کہ غلطی یا خامی جو کچھ ہے وہ اسلام میں ہے اور اس بنا پر یہ " پرستارانِ دانش " دینِ حق سے بدظن ہیں ۔ کیا اس بات کا قوی امکان نہیں کہ مغرب کے یہ شیدائی اسلامی نظامِ حیات کے قیام سے اس لیے گریزاں ہیں کہ ان کے بگڑے ہوئے مزاج ان اخلاقی پابندیوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے جو اس نظام کے قیام کے بعد ان پر لازمی طور پر عائد ہوں گی یا وہ اپنی زندگیوں میں وہ تبدیلیاں لانے سے قاصر ہیں جن کا اسلام تقاضا کرتا ہے ۔ اگر کوئی شخص کسی نظریہ یا نظام کو مسترد کرتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہوتی کہ اس نظریے اور نظام میں بعض اسقام پائے جاتے ہیں ۔ بسا اوقات انسان کے اندر کا شیطان بھی اسے قبول کرنے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے ۔ جو لوگ حق و صداقت کا راستہ چھوڑ کر باطل کی راہ اختیار کرتے ہیں وہ اس بنا پر ایسا نہیں کرتے کہ حق و صداقت میں انہیں بعض خامیاں نظر آتی ہیں ، بلکہ وہ اس راہ پر اس بنا پر گامزن نہیں ہو سکتے کہ اس راستہ پر چل کر انہیں نفس کی بعض ترغیبات سے دامن کش رہنا اور اس راہ کی بعض دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، جس کے لیے وہ اپنے اندر ہمت نہیں پاتے۔

لیکن ان میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی اس کمزوری کا برملا اعتراف کرلیں - یہ اعتراف بڑے دل گردے کا کام ہے - اس سے وہ اپنے اندر ایک قسم کی خفت محسوس کرتے ہیں - اس لیے وہ اپنی ان کمزوریوں کو چھپانے اور اپنی جھوٹی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں پر جوں کا توں قائم رکھنے کے لیے حق وصداقت کے اندر خامیوں کا تذکرہ شروع کر دیتے ہیں اور لوگوں کو یہ باور کرانے لگتے ہیں کہ جس راستہ کو وہ حق وصداقت کی راہ خیال کررہے ہیں وہ تو سرے سے سلامتی کا راستہ ہے ہی نہیں بلکہ یہ راستہ انہیں ایک غلط سمت کی طرف لے جائے گا جس پر چل کر وہ خوفناک تباہی سے دوچار ہوں گے - اگر یہ راستہ فی الحقیقت سلامتی کا راستہ ہوتا تو اہل دانش" اس راہ پر گامزن ہونے سے کیوں گریز کرتے - ان کی اس الٹی منطق کا صاف مطلب یہ ہے کہ حق وصداقت کا اصل معیار وہ نہیں جو بھی اللہ اور اس کے رسولؐ نے دیا ہے بلکہ ان دانشوروں کی پسند اور ناپسند ہے - وہ جس چیز کو صحیح قرار دیں وہی فی الحقیقت صحیح اور برحق ہے اور جس کے بارے میں ان کی زبان سے باطل کا فتویٰ صادر ہو جائے وہ لازمی طور پر گمراہی ہی ہے - جسٹس صاحب کی یہ نکتہ آفرینی ملاحظہ ہو -

> " (مسلمانوں) کے لیے اب دو ہی راستے ہیں - ایک تو یہ کہ دنیائے (اسلام) میں جو لوگ بھی مسند اقتدار پر فائز ہیں انہیں مع مسلم دانشوروں کے ناقابلِ اصلاح سمجھ کر یکسر نظر انداز کر دیا جائے - دوسرا یہ کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ کیا ہمارے مطالبات کو عملی طور پر پورا بھی کیا جا سکتا ہے اور اگر انہیں فی الحقیقت دنیائے عمل میں پورا کیا جا سکتا ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ سوچنے سمجھنے والے مسلمان جو دنبوی معاملات کا فہم بھی رکھتے ہیں وہ ان مطالبات (کے تسلیم کرنے میں) مزاحم ہوتے ہیں - وہ آخر ایسے ناسمجھ تو نہیں کہ مسلم قوم کی عظیم اکثریت کو مطمئن رکھنے کی قدر وقیمت کو نہ جانتے ہوں " ۳۷

جسٹس صاحب اس اندوہناک صورتِ حال پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آج دنیائے اسلام میں اگر دینی نظام سے گریز کی راہ اختیار کی جا رہی ہے تو اس کی کسی طرح بھی ذمہ داری ان " معاملہ فہم " اور باعمل افراد پر عائد نہیں ہوتی جنہیں مغربی استعمار ان بدنصیب ممالک میں اپنا جانشین بنا کر مسند اقتدار پر متمکن چھوڑ گیا ہے - بلکہ ان رجعت پسند مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ احکام الٰہی میں کوئی تغیر و تبدل

(باقی برصفحہ ۴۵)

فصل چہارم

آخرت پر ایمان لانے کی دعوت

(۲)

امکانِ آخرت کے دلائل منکرینِ آخرت اپنے انکار کے حق میں جو کچھ کہتے تھے اس کو نقل کر کے قرآن مجید میں جگہ جگہ وہ دلائل دیے گئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آخرت کا آنا قطعی طور پر ممکن ہے، اور اسے ممکن سمجھنا نہیں بلکہ غیر ممکن سمجھنا خلافِ عقل ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ. وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۚ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۔ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (یٰس ۔ ۷۷ تا ۷۹)

کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اُسے ایک بوند سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا ؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے "کون اِن ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں" ؟ اس سے کہو، اِنہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔

یعنی وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ ہم نے بے جان مادہ سے وہ ابتدائی جرثومۂ حیات پیدا کیا جو اُس کا ذریعۂ تخلیق بنا، اور پھر اُس جرثومے کو پرورش کر کے اسے یہاں تک بڑھا لائے کہ آج وہ ہمارے سامنے باتیں چھانٹنے کے قابل ہوا ہے۔ وہ یہاں بھی عام مخلوقات کی طرح عاجز سمجھ رہا ہے اور اِس خیالِ خام میں مبتلا ہے کہ جس طرح انسان مُردے کو زندہ نہیں کر سکتا اسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔ اِسی لیے پوچھتا ہے کہ "ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ ابن عباسؓ، قتادہؒ اور سعیدؒ بن جُبیر کی روایت ہے کہ اس موقع پر کفارِ مکہ میں سے ایک شخص قبرستان سے کسی مُردے کی ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آگیا اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے

توڑ کر اور اس کے منتشر اجزاء ہوا میں اُڑا کر آپ سے کہا، "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، تم کہتے ہو کہ مُردے زندہ کر کے پھر اُٹھائے جائیں گے۔ اب بتاؤ، ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا"؟ اس کا مختصر ترین اور بلیغ ترین جواب یہ دیا گیا کہ وہی جس نے اِسے پہلے پیدا کیا تھا۔

وَقَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا
ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝
قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝
اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ
فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ
قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ
فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ
وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ
عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ۝
يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ
بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ
اِلَّا قَلِيْلًا ۝

(بنی اسرائیل ۴۹ تا ۵۲)

وہ کہتے ہیں "جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اُٹھائے جائیں گے"؟ — ان سے کہو "تم پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز جو تمہارے ذہن میں قبولِ حیات سے بعید تر ہو (پھر بھی تم اُٹھ کر رہو گے)" وہ ضرور پوچھیں گے "کون ہے وہ جو ہمیں پھر زندگی کی طرف پلٹا کر لائے گا"؟ جواب میں کہو "وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا" وہ (مذاق اُڑانے کے انداز میں) سر ہلا ہلا کر پوچھیں گے "اچھا، تو یہ ہوگا کب"؟ تم کہو "کیا عجب کہ وہ وقت قریب ہی آ لگا ہو، جس روز وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمہارا گمان اس وقت یہ ہوگا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں۔"

یعنی دنیا میں مرنے کے وقت سے لے کر قیامت میں اُٹھنے کے وقت تک کی مدت تم کو چند گھنٹوں سے زیادہ محسوس نہ ہوگی۔ تم اُس وقت یہ سمجھو گے کہ ہم ذرا دیر سوئے پڑے تھے کہ یکایک اِس شورِ محشر نے ہمیں جگا اُٹھایا۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا
مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ
حَيًّا ۔ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ
اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ
يَكُ شَيْئًا (مریم ۶۶ تا ۶۷)

انسان کہتا ہے کیا واقعی جب میں مر چکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں رہا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّى وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۔

لوگو، اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقتِ خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اُس پر مینہ برسایا، یکایک وہ پھبک اُٹھی اور پھول گئی اور اُس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اُگلنی شروع کر دی۔

(الحج: ۵)

مٹی سے پیدا کرنے کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ہر انسان اُن مادوں سے پیدا کیا جاتا ہے جو سب کے سب زمین سے حاصل ہوتے ہیں اور اس تخلیق کی ابتدا نطفے سے ہوتی ہے۔ یا یہ کہ نوعِ انسانی کا آغاز آدم علیہ السلام سے کیا گیا جو براہِ راست مٹی سے بنائے گئے تھے، اور پھر آگے نسلِ انسانی کا سلسلہ نطفے سے چلا، جیسا کہ سورۂ سجدہ میں فرمایا:

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ ۔ (آیات ۷، ۸)

انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل ایک ست سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے۔

دونوں صورتوں میں یہ بہر حال ثابت ہے کہ زندہ انسان کی تخلیق بے جان مادّوں کو جمع کر کے کی گئی ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اُن مختلف اطوار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے استقرارِ حمل کے بعد بچہ ماں کے پیٹ میں گزرتا ہے۔ اُن کی وہ تفصیلات بیان نہیں کی گئیں جو آج کل صرف طاقت ور خوردبین ہی سے نظر آسکتی ہیں، بلکہ اُن بڑے بڑے نمایاں تغیرات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اُس زمانے کے عام بدو بھی واقف تھے۔ یعنی نطفہ قرار پانے کے بعد ابتداءً جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا سا ہوتا ہے، پھر وہ گوشت کی ایک بوٹی میں تبدیل ہوتا ہے جس میں پہلے شکل صورت کچھ نہیں ہوتی اور آگے چل کر انسانی شکل نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ اِسقاط کی مختلف حالتوں میں چونکہ تخلیق انسانی کے یہ سب مراحل لوگوں کے مشاہدے میں آتے تھے، اس لیے انہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اِس کے بعد اس سوال کا جواب انسان کے اپنے فہم پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو خدا انسان کو اس طرح پیدا کرتا ہے اور پروان چڑھاتا ہے اس کے لیے آخر اُسے دوبارہ پیدا کرنا کیوں ناممکن ہو؟

وَقَالُوٓا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ	اور یہ لوگ کہتے ہیں: "جب ہم مٹی میں رَل مِل چکے
ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ؕ بَلۡ	ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟"
هُمۡ بِلِقَآئِ رَبِّهِمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿﴾	اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔
قُلۡ يَتَوَفّٰٮكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ	ان سے کہو "موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے
الَّذِیۡ وُكِّلَ بِكُمۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ	تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے
تُرۡجَعُوۡنَ ۔ (السجدہ ۱۰-۱۱)	رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے۔

پہلے فقرے اور آخری فقرے کے درمیان پوری ایک داستان ہے جسے سامع کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کفار کا جو اعتراض پہلے فقرے میں نقل کیا گیا ہے وہ اِتنا مُہمل تھا کہ اس کی تردید کی حاجت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کا محض نقل کر دینا ہی اس کی لغویت ظاہر کرنے کے لیے کافی سمجھا گیا۔ اس لیے کہ اُن کا اعتراض جن دو اجزاء پر مشتمل ہے وہ دونوں ہی سراسر غیر معقول ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ "ہم مٹی میں رَل مِل گئے ہوں گے" آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ "ہم" جس چیز کا نام ہے وہ کب مٹی میں رَلتی مِلتی ہے؟ مٹی میں تو صرف وہ جسم ملتا ہے جس سے "ہم" نکل چکا ہوتا ہے۔ اُس جسم کا نام "ہم" نہیں ہے۔ زندگی کی حالت میں جب اس جسم کے اعضا کاٹے جاتے ہیں تو عضو پر عضو کٹتا چلا جاتا ہے مگر "ہم" پورا کا پورا اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ اُس کا کوئی جُز بھی کسی کٹے ہوئے عضو کے ساتھ نہیں جاتا۔ اور جب یہ "ہم" کسی جسم میں سے نکل جاتا ہے تو پھر پورا جسم موجود ہوتے

ہوئے بھی اُس پر اس "ہم" کے کسی ادنیٰ شائبے تک کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اِسی لیے تو ایک عاشقِ جان نثار اپنے معشوق کے مُردہ جسم کو لے جاکر دفن کر دیتا ہے، کیونکہ معشوق اُس جسم سے نکل چکا ہوتا ہے اور عاشق اپنے معشوق کو نہیں بلکہ اُس خالی جسم کو دفن کرتا ہے جس میں کبھی اس کا معشوق رہتا تھا۔ پس معترضین کے اعتراض کا پہلا مقدمہ ہی بے بنیاد ہے۔ رہا اُس کا دوسرا جزو کہ "کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" تو یہ انکار و تعجب کے انداز کا سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا اگر معترضین نے بات کرنے سے پہلے اِس "ہم" اور اِس کے پیدا کیے جانے کے مفہوم پر ایک لمحہ کے لیے بھی کچھ غور کر لیا ہوتا۔ اِس "ہم" کی موجودہ پیدائش اِس کے سوا کیا ہے کہ کہیں سے کوئلہ اور کہیں سے لوہا اور کہیں سے چونا اور اسی طرح کے دوسرے اجزا جمع ہوئے اور اِس کالبدِ خاکی میں یہ "ہم" براجمان ہو گیا۔ پھر اُس کی موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اِس کالبدِ خاکی میں سے جب "ہم" نکل جاتا ہے تو اُس کا مکان تعمیر کرنے کے لیے جو اجزا زمین کے مختلف حصوں سے فراہم کیے گئے تھے وہ سب اُسی زمین میں واپس چلے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس نے پہلے اِس "ہم" کو یہ مکان بنا کر دیا تھا، کیا وہ دوبارہ اُسی سروسامان سے وہی مکان بنا کر اُسے از سرِ نو اُس میں نہیں بسا سکتا؟ یہ چیز جب پہلے ممکن تھی اور ممکن کیا معنی، واقعہ کی صورت میں رُونما ہو بھی چکی ہے، تو دوبارہ اس کے ممکن ہونے اور واقعہ بننے میں آخر کیا امر مانع ہے؟ یہ باتیں ایسی ہیں جنھیں ذرا سی عقل آدمی استعمال کرے تو خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنی عقل کو اِس رُخ پر کیوں نہیں جانے دیتا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے حیات بعد الموت اور آخرت پر اِس طرح کے لایعنی اعتراضات جڑتا ہے؟ بیچ کی ساری بحث چھوڑ کر اللہ تعالیٰ دوسرے فقرے میں اِسی سوال کا جواب دیتا ہے کہ "دراصل یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔ یعنی اصل بات یہ نہیں ہے کہ دوبارہ پیدائش کوئی بڑی ہی انوکھی اور بعید از امکان بات ہے جو ان کی سمجھ میں نہ آسکتی ہو، بلکہ دراصل جو چیز انھیں یہ بات سمجھنے سے روکتی ہے وہ ان کی یہ خواہش ہے کہ ہم زمین میں چھوٹے پھریں اور دل کھول کر گناہ کریں اور پھر بلُوہ (SCOT FREE) یہاں سے نکل جائیں، پھر ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہو، پھر اپنے کرتوتوں کا کوئی حساب ہمیں نہ دینا پڑے۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ تمھارا "ہم" جس مکان میں رہتا ہے وہ تو ضرور مٹی میں رَل مِل جائے گا، مگر خود یہ "ہم" مٹی میں نہ ملے گا بلکہ اس کی مہلتِ عمل ختم ہوتے ہی خدا کا فرشتۂ موت آئے گا اور اُسے جسم سے نکال کر سموچا اپنے قبضے میں لے لے گا۔ اُس کا کوئی ادنیٰ سا جز بھی جسم کے ساتھ مٹی میں نہ جا سکے گا۔ وہ

پورا کا پورا حراست (C U S T O D Y) میں لے لیا جائے گا اور اپنے رب کے حضور پیش کر دیا جائے گا۔

اس مختصر سی آیت میں بہت سے حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر سے سرسری طور پر نہ گزر جائیے :-

۱ - اس میں تصریح ہے کہ موت کچھ یونہی نہیں آ جاتی کہ ایک گھڑی چل رہی تھی، کوک ختم ہوئی اور وہ چلتے چلتے یکایک بند ہو گئی۔ بلکہ دراصل اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو آ کر روح کو ٹھیک اسی طرح باقاعدہ وصول کرتا ہے جس طرح ایک سرکاری (ترق ایمن (OFFICIAL RECIEVER) کسی چیز کو اپنے قبضے میں لیتا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات پر اس کی مزید تفصیلات جو بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس افسر موت کے تحت فرشتوں کا ایک پورا عملہ ہے جو موت وارد کرنے اور روح کو جسم سے نکالنے اور اس کو قبضے میں لینے کی بہت سی مختلف النوع خدمات انجام دیتا ہے۔ نیز یہ کہ اس عملے کا برتاؤ مجرم روح کے ساتھ کچھ اور ہوتا ہے اور مومن صالح روح کے ساتھ کچھ اور۔ (ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ نساء آیت ۹۷ الانعام، ۹۳ — النحل، ۲۸، — الواقعہ ۸۳ — ۹۴)۔

۲ - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت سے انسان معدوم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کی روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے۔ قرآن کے الفاظ "موت کا فرشتہ تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا" اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ کوئی معدوم چیز قبضے میں نہیں لی جاتی۔ قبضے میں لینے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ مقبوضہ چیز قابض کے پاس رہے۔

۳ - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت جو چیز قبضے میں لی جاتی ہے وہ آدمی کی حیوانی زندگی (BIOLOGICAL LIFE) نہیں بلکہ اس کی وہ خودی، اس کی وہ انا (EGO) ہے جو "میں" اور "ہم" اور "تم" کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ انا دنیا میں کام کر کے جیسی کچھ شخصیت بھی بنتی ہے وہ پوری کی پوری، جوں کی توں (INTACT) نکال لی جاتی ہے بغیر اس کے کہ اس کے اوصاف میں کوئی کمی بیشی ہو۔ اور یہی چیز موت کے بعد اپنے رب کی طرف پلٹائی جاتی ہے۔ اسی کو آخرت میں نیا جنم اور نیا جسم دیا جائے گا، اسی پر مقدمہ قائم کیا جائے گا، اسی سے حساب لیا جائے گا اور اسی کو جزا و سزا دیکھنی ہوگی۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا — پھر ذرا ان سے پوچھو، ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے

اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ۔

یا اُن چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟ ان کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔

(الصّٰفّٰت - ۱۱)

یہ کفارِ مکہ کے اُس شبہ کا جواب ہے جو وہ آخرت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ آخرت ممکن نہیں ہے، کیونکہ مرے ہوئے انسانوں کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے۔ اس کے جواب میں امکانِ آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اُن کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ اگر تمہارے نزدیک مرے ہوئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا بڑا سخت کام ہے جس کی قدرت تمہارے خیال میں ہم کو حاصل نہیں ہے تو بتاؤ کہ یہ زمین و آسمان اور یہ بے شمار اشیاء جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، ان کا پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے؟ آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ جس خدا کے لیے یہ عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا، اور جو خود تم کو ایک دفعہ پیدا کر چکا ہے، اس کے متعلق تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری دوبارہ تخلیق سے وہ عاجز ہے۔ پھر فرمایا جاتا ہے کہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے۔ مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اُسی مٹی سے بنایا جا سکتا ہے۔ اُس کا سارا مادۂ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے وہ غذا سے بنتا ہے، اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزاء سے مرکب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخر کار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور اُن حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔ پس بنائے استدلال یہ ہے کہ یہ مٹی اگر حیات قبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کیے جانے کا آج امکان ہے، جیسا کہ تمہارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اِسی مٹی سے تمہاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہوگی؟

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے کی بہ نسبت زیادہ بڑا کام ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

(المومن - ۵۷)

یہ کفار کے اِس خیال کا جواب ہے کہ انسان کا مر کر دوبارہ جی اُٹھنا غیر ممکن ہے۔ اِس پر ارشاد فرمایا

جا رہا ہے کہ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ درحقیقت نادان ہیں۔ اگر عقل سے کام لیں تو اُن کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ ہو کہ جس خدا نے یہ عظیم الشان کائنات بنائی ہے اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا کوئی دشوار کام نہیں ہو سکتا۔

ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ۔

کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی جس کو اللہ نے بنایا ہے؟

(النّٰزعٰت: ۲۷)

تخلیق سے مراد انسانوں کی دوبارہ تخلیق ہے اور آسمان سے مراد وہ پورا عالمِ بالا ہے جس میں بے شمار تارے اور سیارے، بے حد و حساب شمسی نظام اور اَن گنت کہکشاں پائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو کوئی بڑا ہی امرِ محال سمجھتے ہو، اور بار بار کہتے ہو کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی ہوں گی اُس حالت میں ہمارے پراگندہ اجزائے جسم پھر سے جمع کر دیے جائیں اور ان میں جان ڈال دی جائے، کبھی اس بات پر بھی غور کرتے ہو کہ اس عظیم کائنات کا بنانا زیادہ سخت کام ہے یا تمہیں ایک مرتبہ پیدا کر چکنے کے بعد دوبارہ اسی شکل میں پیدا کر دینا؟ جس خدا کے لیے وہ کوئی مشکل کام نہ تھا اس کے لیے آخر یہ کیوں ایسا مشکل کام ہے کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے؟

وَقَالُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۚ ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ؕ قُلۡ نَعَمۡ وَاَنۡتُمۡ دَاخِرُوۡنَ ۚ فَاِنَّمَا هِىَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ وَقَالُوۡا يٰوَيۡلَنَا هٰذَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ۔ (الصّٰفّٰت - ۱۵ تا ۲۰)

اور کہتے ہیں "یہ تو صریح جادو ہے۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اُس وقت ہم پھر زندہ کر کے اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آبا و اجداد بھی اُٹھائے جائیں گے؟" ان سے کہو ہاں، اور تم خدا کے مقابلے میں بے بس ہو۔ بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں گے۔ اُس وقت یہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی، یہ تو یوم الجزا ہے۔

ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ تو عالمِ طلسمات کی باتیں ہیں۔ کوئی جادو کی دنیا ہے جس کا یہ شخص ذکر کر رہا ہے، جس میں مرے

اُٹھیں گے، عدالت ہوگی، جنت بسائی جائے گی اور دوزخ کے عذاب ہوں گے۔ یا اُن کے قول کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ شخص دل چلوں کی سی باتیں کر رہا ہے، اس کی یہ باتیں ہی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کسی نے اِس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے بھلا چنگا آدمی یہ باتیں کرنے لگا۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا اور تم اپنے خدا کے آگے بے بس ہو۔ وہ جو کچھ بھی تمہیں بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ جب اُس نے چاہا اُس کے ایک اشارے پر تم وجود میں آگئے۔ جب وہ چاہے گا اس کے ایک اشارے پر تم مر جاؤ گے۔ اور پھر جس وقت بھی وہ چاہے گا اس کا ایک اشارہ تمہیں اُٹھا کھڑا کرے گا۔ اِس کام کا وقت جب آئے گا تو دنیا کو دوبارہ برپا کر دینا کوئی بڑا لمبا چوڑا کام نہ ہوگا۔ بس ایک ہی جھڑکی سونوں کو جگا اُٹھانے کے لیے کافی ہوگی۔ "جِھڑکی" کا لفظ یہاں بہت معنی خیز ہے۔ اس سے بعث بعد الموت کا کچھ ایسا نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے تھے وہ گویا سوئے پڑے تھے۔ یکایک کوئی ڈانٹ کر کہتا ہے "اُٹھ جاؤ" اور بس آن کی آن میں سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ	(یہ لوگ آخرت کو نہیں مانتے، تو کیا اونٹوں کو نہیں
خُلِقَتۡ ۞ وَ اِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ	دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے
رُفِعَتۡ ۞ وَ اِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ	اُٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے
نُصِبَتۡ ۞ وَ اِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ	گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے
سُطِحَتۡ ۞ (الغاشیہ- ۱۷ تا ۲۰)	بچھائی گئی؟

یعنی اگر یہ لوگ آخرت کی یہ باتیں سُن کر کہتے ہیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے تو کیا خود اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈال کر انہوں نے کبھی نہ سوچا کہ یہ اُونٹ کیسے بن گئے؟ یہ آسمان کیسے بلند ہو گیا؟ یہ پہاڑ کیسے قائم ہو گئے؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ یہ ساری چیزیں اگر بن سکتی تھیں اور بنی ہوئی اِن کے سامنے موجود ہیں تو قیامت کیوں نہیں آسکتی؟ آخرت میں ایک دوسری دُنیا کیوں نہیں بن سکتی؟ دوزخ اور جنت کیوں نہیں ہو سکتیں؟ یہ تو ایک بے عقل اور بے فکر آدمی کا کام ہے کہ دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی جن چیزوں کو اس نے موجود پایا ہے اُن کے متعلق تو وہ یہ سمجھ لے کہ اُن کا وجود میں آنا تو ممکن ہے کیونکہ وہ وجود میں آئی ہوئی ہیں، مگر جو چیزیں اس کے مشاہدے اور تجربے میں ابھی نہیں آئی ہیں ان کے بارے میں وہ بے تکلف یہ فیصلہ صادر کر دے کہ ان کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس کے دماغ میں اگر عقل ہے تو اسے سوچنا چاہیے کہ جو کچھ موجود ہے یہ آخر کیسے وجود میں آگیا؟

بالکل ٹھیک ٹھیک اُن خصوصیات کے مطابق کیسے بن گئے جن خصوصیات کے جانور کی عرب کے صحرا میں رہنے والے انسانوں کو ضرورت تھی ؟ یہ آسمان کیسے بن گیا جس کی فضا میں سانس لینے کے لیے ہوا بھری ہوئی ہے، جس کے بادل بارش برساتے ہیں، جس کا سورج دن کی روشنی اور گرمی فراہم کرتا ہے، جس کے چاند اور تارے رات کو چمکتے ہیں؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی جس پر انسان رہتا بستا ہے، جس کی پیداوار سے اُس کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں، جس کے چشموں اور کنوؤں پر اُس کی زندگی کا انحصار ہے ؟ یہ پہاڑ زمین کی سطح پر کیسے اُبھر آئے جو رنگ برنگ کی مٹی اور پتھر اور طرح طرح کی معدنیات لیے ہوئے جمے کھڑے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مطلق، صانعِ حکیم کی کاریگری کے بغیر ہوگیا ہے ؟ کوئی سوچنے اور سمجھنے والا دماغ اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا۔ وہ اگر ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ ان میں سے ہر چیز ناممکن تھی اگر کسی زبردست قدرت اور حکمت والے نے اسے ممکن نہ بنایا ہوتا۔ اور جب ایک قادر کی قدرت سے دنیا کی ان چیزوں کا بننا ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جن چیزوں کے آئندہ وجود میں آنے کی خبر دی جا رہی ہے اُن کو بعید از امکان سمجھا جائے۔

اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَۃً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی۔ — کیا انسان ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحمِ مادر میں)
ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی۔ — ٹپکایا جاتا ہے ؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس
فَجَعَلَ مِنۡہُ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ — کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے۔ پھر اس سے
وَ الۡاُنۡثٰی۔ اَلَیۡسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ — مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر
عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی۔ — نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کرے ؟

(القیٰمۃ: ۳۷-۴۰)

یہ حیات بعدِ موت کے امکان کی دلیل ہے۔ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو یہ مانتے ہیں کہ ابتدائی نطفے سے تخلیق کا آغاز کر کے پورا انسان بنا دینے تک کا سارا فعل اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ ہے، ان کے لیے فی الحقیقت اس دلیل کا کوئی جواب ہے ہی نہیں، کیونکہ وہ خواہ کتنی ہی ڈھٹائی برتیں، اُن کی عقل یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی کہ جو خدا اس طرح انسان کو دنیا میں پیدا کرتا ہے وہ دوبارہ بھی اسی انسان کو وجود میں لے آنے پر قادر ہے۔ رہے وہ لوگ جو اس صریح حکیمانہ فعل کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، وہ اگر ہٹ دھرمی پر تُلے ہوئے نہیں ہیں تو آخر ان کے پاس اس بات کی کیا توجیہ ہے کہ آغازِ آفرینش

سے آج تک دنیا کے ہر حصے اور ہر قوم میں کس طرح ایک ہی نوعیت کے تخلیقی فعل کے نتیجے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش مسلسل اس تناسب سے ہوتی چلی جا رہی ہے کہ کہیں کسی زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی انسانی آبادی میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتی چلی جائیں اور آئندہ اس کی نسل چلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے؟ کیا یہ بھی اتفاقاً ہی ہوئے چلا جا رہا ہے؟ اتنا بڑا دعویٰ کرنے کے لیے آدمی کو کم از کم اتنا بے شرم ہونا چاہیے کہ وہ اُٹھ کر بے تکلف ایک روز یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ لندن اور نیویارک، ماسکو اور پیکنگ اتفاقاً آپ سے آپ بن گئے ہیں۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝	پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا
خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ	کیا گیا ہے۔ ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے
مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝	جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔
إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝	یقیناً وہ (خالق) اُسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔

(الطارق ۵ تا ۸)

یعنی انسان ذرا اپنی ہستی ہی پر غور کرے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ کون ہے جو باپ کے جسم سے خارج ہونے والے اربوں جرثوموں میں سے کسی ایک جرثومے اور ماں کے اندر سے مہینوں اور برسوں تک نکلنے رہنے والے بیضوں میں سے کسی ایک بیضے کا انتخاب کر کے ایک وقت دونوں کو جوڑ دیتا ہے اور اس سے ایک خاص انسان کا استقرارِ حمل واقع ہو جاتا ہے؟ پھر کون ہے جو استقرارِ حمل کے بعد سے ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ نشوونما دے کر اُسے اس حد کو پہنچاتا ہے کہ وہ ایک زندہ بچے کی شکل میں پیدا ہو؟ پھر کون ہے جو رحم مادر ہی میں اُس کے جسم کی ساخت اور اس کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کا تناسب قائم کرتا ہے؟ پھر کون ہے جو پیدائش سے لے کر موت کے وقت تک اس کی مسلسل نگہبانی کرتا رہتا ہے؟ اسے بیماریوں سے بچاتا ہے، حادثات سے بچاتا ہے، طرح طرح کی آفات سے بچاتا ہے۔ اس کے لیے زندگی کے اتنے ذرائع بہم پہنچاتا ہے جن کا شمار نہیں ہوسکتا۔ اور اس کے لیے ہر قدم پر دنیا میں باقی رہنے کے وہ مواقع فراہم کرتا ہے جن میں سے اکثر کا اسے شعور تک نہیں ہوتا کجا کہ وہ انہیں خود فراہم کرنے پر قادر ہو۔ کیا یہ سب کچھ ایک خدا کی تدبیر اور نگرانی کے بغیر ہو رہا ہے؟ اگر کوئی صاحبِ عقل آدمی اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا تو یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ جس طرح وہ انسان کو وجود میں لاتا ہے اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی نگہبانی کرتا ہے، یہی اس بات

کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ وہ اُسے موت کے بعد پلٹا کر پھر وجود میں لا سکتا ہے۔ اگر وہ پہلی چیز پر قادر تھا اور اُسی قدرت کی بدولت انسان اِس وقت دنیا میں زندہ موجود ہے، تو آخر کیا معقول دلیل یہ گمان کرنے کے لیے پیش کی جا سکتی ہے کہ دوسری چیز پر وہ قادر نہیں ہے۔ اِس قدرت کا انکار کرنے کے لیے آدمی کو سرے سے اِس بات ہی کا انکار کرنا ہوگا کہ خدا اُسے وجود میں لایا ہے، اور جو شخص اِس کا انکار کر سکتا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ ایک روز اُس کے دماغ کی خرابی اُس سے یہ دعویٰ بھی کرا دے کہ دنیا کی تمام کتابیں ایک حادثے کے طور پر چھپ گئی ہیں، دنیا کے تمام شہر ایک حادثے کے طور پر بن گئے ہیں، اور زمین پر کوئی اتفاقی حادثہ ایسا ہو گیا تھا جس سے تمام کارخانے بن کر خود بخود چلنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اور اس کے جسم کی بناوٹ اور اس کے اندر کام کرنے والی قوتوں اور صلاحیتوں کا پیدا ہونا اور اس کا ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے باقی رہنا اُن تمام کاموں سے بدرجہا زیادہ پیچیدہ عمل ہے جو انسان کے ہاتھوں دنیا میں ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اتنا بڑا پیچیدہ عمل اِس حکمت اور تناسب اور تنظیم کے ساتھ اگر اتفاقی حادثہ کے طور پر ہزاروں لاکھوں برس تک ایک تسلسل کے ساتھ ہو سکتا ہو تو پھر کونسی چیز ہے جسے ایک دماغی مریض حادثہ نہ کہہ سکے؟

بَلْ عَجِبُوٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ ۝ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِیْظٌ (قٓ ۲ تا ۴)

بلکہ ان لوگوں کو تعجب اِس بات پر ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود اِنہی میں سے اِن کے پاس آگیا پھر منکرین کہنے لگے "یہ تو عجیب بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے، تو دوبارہ اُٹھائے جائیں گے،؟ یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے"۔ (حالانکہ) زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔

اُن لوگوں کو پہلا تعجب تو اِس بات پر تھا کہ اُنہی کی جنس اور قوم کے ایک فرد نے اُٹھ کر دعویٰ کیا تھا کہ میں خدا کی طرف سے تمہیں خبردار کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اِس کے بعد مزید تعجب انہیں اِس پر ہوا کہ وہ شخص انہیں جس چیز سے خبردار کر رہا تھا وہ یہ تھی کہ تمام انسان مرنے کے بعد ازسرِنو زندہ کیے جائیں گے، اور ان سب کو اکٹھا کر کے اللہ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اور وہاں ان کے اعمال کا محاسبہ کرنے کے بعد جزا اور سزا دی

جائے گی۔ اس پر فرمایا گیا کہ یہ بات اگر اِن لوگوں کی عقل میں نہیں سماتی تو یہ ان کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے۔ اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اللہ کا علم اور اس کی قدرت بھی تنگ ہو جائے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک مرنے والے بے شمار انسانوں کے اجزائے جسم جو زمین میں بکھر چکے ہیں اور آئندہ بکھرتے چلے جائیں گے اُن کو جمع کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن میں سے ہر ہر جُز جس شکل میں جہاں بھی ہے، اللہ تعالیٰ براہ راست اس کو جانتا ہے اور مزید برآں اس کا پورا ریکارڈ اللہ کے دفتر میں محفوظ کیا جا رہا ہے جس سے کوئی ایک ذرّہ بھی چھوٹا ہوا نہیں ہے۔ جس وقت اللہ کا حکم ہوگا اُسی وقت آناً فاناً اس کے فرشتے اس ریکارڈ سے رجوع کرکے ایک ایک ذرّے کو نکال لائیں گے اور تمام انسانوں کے وہی جسم پھر بنا دیں گے جن میں رہ کر اُنھوں نے دُنیا کی زندگی میں کام کیا تھا۔

یہ آیت بھی من جملہ اُن آیات کے ہے جن میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ آخرت کی زندگی نہ صرف یہ کہ ویسی ہی جسمانی زندگی ہوگی جیسی اس دنیا میں ہے، بلکہ جسم بھی ہر شخص کا وہی ہوگا جو اِس دُنیا میں تھا۔ اگر حقیقت یہ نہ ہوتی تو کفار کی بات کے جواب میں یہ کہنا بالکل بے معنی تھا کہ زمین تمہارے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ذرّہ ذرّہ کا ریکارڈ موجود ہے۔

اَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۔ بَلْ	تو کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک
هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ	نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

(قٓ - ۱۵)

یہ آخرت کے حق میں عقلی استدلال ہے۔ جو شخص خدا کا منکر نہ ہو اور حماقت کی اس حد تک نہ پہنچ گیا ہو کہ اِس منظّم کائنات اور اِس کے اندر انسان کی پیدائش کو محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے لگے، اس کے لیے یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ خدا ہی نے ہمیں اور اس پوری کائنات کو بنایا ہے۔ اب یہ امرِ واقعہ کہ ہم اس دنیا میں موجود ہیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، آپ ہی اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ خدا ہمیں اور اِس کائنات کو پیدا کرنے سے عاجز نہ تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی کہتا ہے کہ قیامت برپا کرنے کے بعد وہی خدا ایک دوسرا نظامِ عالم نہ بنا سکے گا، اور موت کے بعد وہ ہمیں پھر پیدا نہ کر سکے گا، تو وہ محض ایک خلافِ عقل بات کہتا ہے۔ خدا عاجز ہوتا تو پہلے ہی پیدا نہ کر سکتا۔ جب وہ پہلے پیدا کر چکا ہے اور اسی تخلیق کی بدولت ہم خود وجود میں آئے بیٹھے ہیں، تو یہ فرض کر لینے کے لیے آخر کیا معقول بنیاد ہو سکتی ہے

کہ اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کو توڑ کر پھر بنا دینے سے وہ عاجز ہو جائے گا۔

آخرت کے وجوب کے دلائل | قرآن صرف اِسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ آخرت کو ممکن ثابت کرے، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ آخرت کا برپا ہونا ضروری ہے۔ عقل چاہتی ہے، انصاف چاہتا ہے، اخلاق کے تقاضے چاہتے ہیں کہ آخرت ہو اور اس میں انسان کے تمام اُن اعمال کا محاسبہ کیا جائے جو اُس نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے مرتے دم تک کیے، اور اپنے پیچھے اپنے اُن اعمال کے ایسے اچھے یا بُرے اثرات چھوڑ گیا جو بعد میں مدتہائے دراز تک آنے والی نسلوں کو متاثر کرتے رہے۔ یہ محاسبہ نہ ہو، اور اچھے اعمال کی جزا اور بُرے اعمال کی سزا نہ ہو، تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی یہ دنیا انصاف سے خالی ہے، اور انسان کو یہاں عقل و شعور دے کر، اخلاق کے خیر و شر کی تمیز دے کر، اور بے شمار اشیاء اور دوسرے انسانوں پر اختیارات دے کر فضول اور بے معنی ہی پیدا کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک دنیا کی موجودہ زندگی کا تعلق ہے، اِس میں نہ پورا محاسبہ ممکن ہے، نہ پورا انصاف، اور نہ پوری جزا و سزا۔ اِس لیے لازماً ایک دوسرا عالم برپا ہونا چاہیے جس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک وجود میں آنے والے تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کیا جائے، تمام کھلے اور چھپے اعمال کا اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کا محاسبہ کر کے ایک ایک شخص کی ذمہ داری متعین کی جائے، اور اُس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ ابدی ہو تاکہ جو شخص جتنی سزا کا مستحق ہے وہ پوری بھگت سکے اور جتنے انعام و اکرام کا مستحق ہے وہ اسے پورا دیا جا سکے۔

اِس مضمون کو قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا تاکہ کفار کے پاس انکارِ آخرت کے لیے کوئی دلیل باقی نہ رہے۔

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًى۔ (القیٰمۃ - ۳۶)	کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟

عربی زبان میں اِبلِ سُدًی اُس اُونٹ کو کہتے ہیں جو یونہی چھوٹا پھر رہا ہو۔ جدھر چاہے چرتا پھرے۔ کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔ اِسی معنی میں ہم شُترِ بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شُترِ بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اُسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہو؟ کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو؟ کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو؟ اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اس کے اعمال کی باز پرس کی جائے؟ یہی بات ایک دوسرے مقام پر قرآن مجید میں اِس طرح بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر آنا نہیں ہے؟"

(المومنون: ۱۱۵)

اِن مقامات پر زندگی بعدِ موت کے واجب ہونے کی دلیل سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تم نے اپنے آپ کو جانور سمجھ رکھا ہے؟ کیا تمہیں اپنے اور جانور میں یہ کھلا فرق نظر نہیں آتا کہ وہ بے اختیار ہے اور تم بااختیار، اُس کے افعال میں اخلاقی حُسن و قبح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تمہارے افعال میں یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے؟ پھر تم نے اپنے متعلق یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس طرح جانور غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ ہیں اُسی طرح تم بھی ہو؟ جانور کے دوبارہ زندہ کرکے نہ اٹھائے جانے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ اُس نے صرف اپنی جبلت کے بندھے تقاضے پورے کیے ہیں، اپنی عقل سے کام لے کر کوئی فلسفہ تصنیف نہیں کیا، کوئی مذہب ایجاد نہیں کیا، کسی کو معبود نہیں بنایا نہ خود کسی کا معبود بنا، کوئی کام ایسا نہیں کیا جسے نیک یا بد کہا جا سکتا ہو، کوئی اچھی یا بُری سُنّت جاری نہیں کی جس کے اثرات نسل در نسل چلتے رہیں اور وہ ان پر کسی اجر یا سزا کا مستحق ہو۔ لہٰذا وہ اگر مر کر فنا ہو جائے تو یہ سمجھ میں آنے کے قابل بات ہے کیونکہ اُس پر اپنے کسی عمل کی ذمہ داری عائد ہی نہیں ہوتی جس کی بازپُرس کے لیے اُسے دوبارہ زندہ کرکے اُٹھانے کی کوئی حاجت ہو۔ لیکن تم حیات بعدِ موت سے کیسے معاف کیے جا سکتے ہو جبکہ عین اپنی موت کے وقت تک تم ایسے اخلاقی افعال کرتے رہتے ہو جن کے نیک یا بد ہونے اور جزا و سزا کے مُستوجب ہونے کا تمہاری عقل خود حکم لگاتی ہے؟ جس آدمی نے کسی بے گناہ کو قتل کیا اور فوراً ہی کسی حادثے کا شکار ہو گیا، کیا تمہارے نزدیک اس کو خود (SCOT FREE) چھوٹ جانا چاہیے اور اِس ظلم کا بدلہ اُسے کبھی نہ ملنا چاہیے؟ جو آدمی دنیا میں کسی ایسے فساد کا بیج بو گیا جس کا خمیازہ اُس کے بعد صدیوں تک انسانی نسلیں بھگتتی رہیں، کیا تمہاری عقل واقعی اس بات پر مطمئن ہے کہ اُسے بھی کسی جھینگے یا پِڈّے کی طرح مر کر فنا ہو جانا چاہیے اور کبھی اُٹھ کر اپنے اُن کرتوتوں کی جواب دہی نہیں کرنی چاہیے جن کی بدولت ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگیاں خراب ہوئیں؟ جس آدمی نے عمر بھر حق و انصاف اور خیر و صلاح کے لیے اپنی جان لڑائی اور جیتے جی مصیبتیں ہی بھگتتا رہا، کیا تمہارے خیال میں وہ بھی حشرات الارض ہی کی قسم کی کوئی مخلوق ہے جسے اپنے اِس عمل کی جزا پانے کا کوئی حق نہیں ہے؟

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۔ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (القیٰمۃ: ۱-۲)

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے روز کی، اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔

یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ قیامت نہیں آئے گی۔ میں قسم کھاتا ہوں قیامت اور ملامت کرنے والے نفس کی کہ وہ ضرور آئے گی۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم جس بات پر کھائی ہے اُسے بیان نہیں کیا ہے، کیونکہ بعد کا فقرہ خود اُس پر دلالت کر رہا ہے۔ قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کرے گا اور وہ ایسا کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات پر اِن دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی ہے؟

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے، اُس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا آنا یقینی ہے۔ پوری کائنات کا نظام اِس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ ازلی ہے نہ ابدی۔ اس کی نوعیت ہی خود یہ بتا رہی ہے کہ یہ نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ انسان کی عقل پہلے بھی اس گمان بے اصل کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہ پاتی تھی کہ یہ ہر آن بدلنے والی دنیا کبھی قدیم اور غیر فانی بھی ہو سکتی ہے، لیکن جتنا جتنا اِس دنیا کے متعلق انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اُتنا ہی زیادہ یہ امر خود انسان کے نزدیک بھی یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس ہنگامۂ ہست و بود کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا، اور لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت ہی کی قسم کھائی ہے، اور یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے ہم کسی شکّی انسان کو، جو اپنے موجود ہونے ہی میں شک کر رہا ہو، خطاب کر کے کہیں کہ تمہاری جان کی قسم تم موجود ہو، یعنی تمہارا وجود خود تمہارے موجود ہونے پر شاہد ہے۔

لیکن روزِ قیامت کی قسم صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد پھر انسان دوبارہ اُٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا اور وہ اپنے کیے کا اچھا یا بُرا نتیجہ دیکھے گا، تو اس کے لیے دوسری قسم نفسِ لَوّامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اِس ضمیر میں لازماً بھلائی اور بُرائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے اور چاہے انسان کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اس کا ضمیر اسے کوئی بُرائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اُس نے بھلائی اور بُرائی کا جو معیار بھی قرار دے رکھا ہو وہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ یہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نِرا حیوان نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے۔ اُس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور بُرائی کی تمیز پائی جاتی ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے،

اور جس بُرائی کا ارتکاب اس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو اس پر اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامتوں کو دبا کر خوش بھی ہو لے، تو اِس کے برعکس صورت میں، جبکہ اُسی بُرائی کا ارتکاب کسی دوسرے نے اُس کے ساتھ کیا ہو، اُس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس زیادتی کا مرتکب ضرور سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔ اب اگر انسان کے وجود میں اِس طرح کے نفسِ لوّامہ کی موجودگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ یہی نفسِ لوّامہ زندگی بعدِ موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ فطرت کا یہ تقاضا کہ اپنے جن اچھے اور بُرے اعمال کا انسان ذمہ دار ہے اُن کی جزا یا سزا اُس کو ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعدِ موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پورا نہیں ہو سکتا۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی اِس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرنے کے بعد اگر آدمی معدوم ہو جائے تو اُس کی بہت سی بھلائیاں ایسی ہیں جن کے اجر سے وہ لازماً محروم ہو کر رہ جائے گا، اور اُس کی بہت سی بُرائیاں ایسی ہیں جن کی منصفانہ سزا پانے سے وہ ضرور بچ نکلے گا۔ اس لیے جب تک آدمی اِس بیہودہ بات کا قائل نہ ہو کہ عقل رکھنے والا انسان ایک غیر معقول نظامِ کائنات میں پیدا ہو گیا ہے، اور اخلاقی احساسات رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں جنم لے بیٹھا ہے جو بنیادی طور پر اپنے پورے نظام میں اخلاق کا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی، اُس وقت تک وہ حیات بعدِ موت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تناسخ یا آواگون کا فلسفہ بھی فطرت کے اِس مطالبے کا جواب نہیں ہے۔ کیونکہ اگر انسان اپنے اخلاقی اعمال کی سزا یا جزا پانے کے لیے پھر اسی دنیا میں جنم لیتا چلا جائے تو ہر جنم میں وہ پھر کچھ مزید اخلاقی اعمال کرتا چلا جائے گا جو نئے سرے سے جزا و سزا کے متقاضی ہوں گے اور اِس لامتناہی سلسلے میں بجائے اِس کے کہ اُس کا حساب کبھی چُک سکے، اُلٹا اُس کا حساب بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اس لیے فطرت کا یہ تقاضا صرف اِسی صورت میں پورا ہوتا ہے کہ اِس دُنیا میں انسان کی صرف ایک ہی زندگی ہو، اور پھر پوری نوعِ انسانی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ایک دوسری زندگی ہو جس میں انسان کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک حساب کر کے اسے پوری جزا اور سزا دے دی جائے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ	ہم نے اِس آسمان اور زمین کو، اور اِس دنیا کو جو
وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ	ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے۔ یہ تو
ظَنُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَیْلٌ	اُن لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کُفر کیا ہے، اور
لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ	ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنّم کی آگ سے۔

اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالۡمُفۡسِدِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ۖ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِيۡنَ كَالۡفُجَّارِ	کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک عمل کرتے ہیں اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں ؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں ؟

(ص - ۲۹،۲۸)

یعنی اس کائنات کو ہم نے محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ہے کہ اس میں کوئی حکمت نہ ہو، کوئی غرض اور مقصد نہ ہو، کوئی عدل اور انصاف نہ ہو، اور کسی اچھے یا بُرے فعل کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ اس ارشاد سے مقصود یہ حقیقت سامعین کے ذہن نشین کرانا ہے کہ اللہ ان یہاں شترِ بے مہار کی طرح نہیں چھوڑ دیا گیا ہے اور نہ یہ دُنیا اندھیر نگری ہے کہ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے اور اُس پر کوئی باز پرس نہ ہو۔ جو شخص جزا و سزا کا قائل نہیں ہے اور اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ نیک و بد سب آخر کار مر کر مٹی ہو جائیں گے، کسی سے کوئی محاسبہ نہ ہوگا، نہ کسی کو بھلائی یا بُرائی کا کوئی بدلہ ملے گا، وہ دراصل دنیا کو ایک کھلونا اور اس کے بنانے والے کو کھلنڈرا سمجھتا ہے اور اس کا خیال یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے دُنیا بنا کر اور اس میں انسان کو پیدا کر کے ایک فعلِ عَبَث کا ارتکاب کیا ہے۔ مگر کیا فی الحقیقت تمہارے نزدیک یہ بات معقول ہے کہ نیک اور بد دونوں آخر کار یکساں ہو جائیں ؟ کیا یہ تصور تمہارے لیے اطمینان بخش ہے کہ کسی نیک انسان کو اُس کی نیکی کا کوئی صلہ اور کسی بد آدمی کو اس کی بدی کا کوئی بدلہ نہ ملے ؟ ظاہر بات ہے کہ اگر آخرت نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی محاسبہ نہ ہو اور انسانی افعال کی کوئی جزا و سزا نہ ہو تو اس سے اللہ کی حکمت اور اُس کے عدل دونوں کی نفی ہو جاتی ہے اور کائنات کا پورا نظام ایک اندھا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ اس مفروضے پر تو دنیا میں بھلائی کے لیے کوئی محرک اور بُرائی سے روکنے کے لیے کوئی مانع سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتا۔ خدا کی خدائی اگر معاذ اللہ ایسی ہی اندھیر نگری ہو تو پھر وہ شخص بیوقوف ہے جو اس زمین پر تکلیفیں اُٹھا کر خود صالح زندگی بسر کرتا ہے اور خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کرتا ہے، اور وہ شخص عقل مند ہے جو سازگار مواقع پا کر ہر طرح کی زیادتیوں سے فائدے سمیٹتا اور ہر قسم کے فسق و فجور سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

زَعَمَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنۡ لَّنۡ يُّبۡعَثُوۡا ؕ قُلۡ بَلٰى	منکرین نے بڑے دعوے سے کہا کہ وہ مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اُٹھائے جائیں گے۔ ان سے کہو "نہیں،

وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۚ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ - (التغابن ۷)

میرے رب کی قسم تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے، پھر ضرور تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے (دنیا میں) کیا کچھ کیا ہے، اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے"۔

اگرچہ کسی منکرِ آخرت کے پاس نہ پہلے یہ جاننے کا کوئی ذریعہ تھا، نہ آج ہے، نہ کبھی ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ لیکن ان نادانوں نے ہمیشہ بڑے زور کے ساتھ یہی دعویٰ کیا ہے، حالانکہ قطعیت کے ساتھ آخرت کا انکار کر دینے کے لیے نہ کوئی عقلی بنیاد موجود ہے نہ علمی بنیاد۔

ان کی اس بات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا کہ تم ہماری قسم کھا کر کہو کہ تم لوگ ضرور اٹھائے جاؤ گے اور ضرور تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ تم دنیا میں کیا کر کے آئے ہو۔ یہ تیسرا مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا ہے کہ اپنے رب کی قسم کھا کر لوگوں سے کہو کہ ضرور ایسا ہو کر رہے گا۔ پہلے سورۂ یونس میں فرمایا: "وہ پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ حق ہے؟ کہو، میرے رب کی قسم یہ یقیناً حق ہے اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو" (آیت ۵۳)۔ پھر سورۂ سبا میں فرمایا "منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آرہی ہے! کہو، قسم ہے میرے رب کی وہ تم پر آکر رہے گی" (آیت ۳)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک منکرِ آخرت کے لیے آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ اُسے آخرت کے آنے کی خبر قسم کھا کر دیں یا قسم کھائے بغیر دیں؟ وہ جب اِس چیز کو نہیں مانتا تو محض اس بنا پر کیسے مان لے گا کہ آپ قسم کھا کر اس سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ تھے جو اپنے ذاتی علم اور تجربے کی بنا پر یہ بات خوب جانتے تھے کہ آپؐ کی زبان سے عمر بھر کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں نکلی ہے، اس لیے چاہے زبان سے وہ آپ کے خلاف کیسے ہی بُہتان گھڑتے رہے ہوں، اپنے دلوں میں وہ یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ ایسا سچا انسان کبھی خدا کی قسم کھا کر وہ بات کہہ سکتا ہے جس کے برحق ہونے کا اُسے کامل یقین نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آپؐ محض آخرت کا عقیدہ ہی بیان نہیں کر رہے تھے بلکہ اس کے لیے نہایت معقول دلائل بھی پیش فرما رہے تھے۔ مگر جو چیز نبی اور غیر نبی کے درمیان فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک غیر نبی آخرت کے حق میں جو مضبوط سے مضبوط دلائل دے سکتا ہے ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس یہی ہو سکتا ہے کہ آخرت کے نہ ہونے کی بہ نسبت اس کا ہونا معقول تر اور اغلب تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے برعکس نبی کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالاتر ہے۔ اُس کی اصل حیثیت یہ نہیں ہے کہ عقلی استدلال سے وہ اِس نتیجہ پر پہنچا ہو کہ

آخرت ہونی چاہیے۔ بلکہ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ اس بات کا علم رکھتا ہے کہ آخرت ہوگی اور یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ ضرور ہو کر رہے گی۔ اس لیے ایک نبی ہی قسم کھا کر یہ بات کہہ سکتا ہے، ایک فلسفی اپنے کسی قول پر بھی قسم نہیں کھا سکتا۔ اور آخرت پر ایمان ایک نبی کے بیان ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ فلسفی کا استدلال اپنے اندر یہ قوت نہیں رکھتا کہ دوسرا شخص تو درکنار، فلسفی خود بھی اپنی دلیل کی بنا پر اسے اپنا ایمانی عقیدہ بنا سکے۔ فلسفی اگر واقعی صحیح الفکر فلسفی ہو تو وہ "ہونا چاہیے" سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ "ہے اور یقیناً ہے" کہنا صرف ایک نبی کا کام ہے۔

پھر قسم کھا کر صرف یہی نہیں کہا گیا کہ مرنے کے بعد تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے، بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ اُس وقت ضرور تمھیں یہ بتایا جائے گا کہ دنیا میں تم کیا کر کے آئے ہو۔ یہ وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے بنی آدم کو مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھایا جائے گا، اور اسی میں اس سوال کا جواب بھی آگیا کہ ایسا کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے۔ اِس برحق کائنات میں جس مخلوق کو کفر و ایمان میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے کی آزادی دی گئی ہو اور جسے اِس دنیا میں بہت سی چیزوں پر تصرّف کا اقتدار بھی عطا کیا گیا ہو، اور جس نے کفر یا ایمان کی راہ اختیار کر کے عمر بھر اپنے اس اقتدار کو صحیح یا غلط طریقے سے استعمال کر کے بہت سی بھلائیاں یا بہت سی بُرائیاں خود اپنی ذمہ داری پر کی ہوں، اس کے بارے میں یہ تصور کرنا انتہائی غیر معقول ہے کہ یہ سب کچھ جب وہ کر چکے تو آخر کار بھلے کی بھلائی اور بُرے کی بُرائی، دونوں بے نتیجہ رہیں اور سرے سے کوئی وقت ایسا آئے ہی نہیں جب اِس مخلوق کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو۔ جو شخص ایسی غیر معقول بات کہتا ہے وہ لامحالہ دو حماقتوں میں سے ایک حماقت کا ارتکاب کرتا ہے۔ یا تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات ہے تو مبنی بر حکمت، مگر یہاں انسان جیسی بااختیار مخلوق کو غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک اَلل ٹپ بنی ہوئی کائنات ہے جسے بنانے میں سرے سے کسی حکیم کی حکمت کار فرما نہیں ہے۔ پہلی صورت میں وہ ایک مُتناقض بات کہتا ہے۔ کیونکہ مبنی بر حکمت کائنات میں ایک بااختیار مخلوق کا غیر ذمہ دار ہونا صریحاً خلافِ عدل و حکمت ہے۔ اور دوسری صورت میں وہ اِس بات کی کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکتا کہ ایک اَلل ٹپ بنی ہوئی بے حکمت کائنات میں انسان جیسی ذی عقل مخلوق کا وجود میں آنا آخر کیسے ممکن ہوا؟ اور اُس کے ذہن میں عدل و انصاف کا تصوّر کہاں سے آگیا؟ بے عقلی سے عقل کی پیدائش اور بے عدلی سے عدل کا تصوّر برآمد ہو جانا ایک ایسی بات ہے جس کا قائل یا تو ایک ہٹ دھرم آدمی ہو سکتا ہے یا پھر وہ جو بہت زیادہ فلسفہ بگھارتے بگھارتے دماغی مریض ہو چکا ہو۔

پھر یہ فرمانا کہ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے، یہ آخرت کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل آخرت کے ضروری ہونے کی تھی اور یہ دلیل اس کے ممکن ہونے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس خدا کے لیے کائنات کا اتنا بڑا نظام بنا دینا دشوار نہ تھا اور جس کے لیے اس دنیا میں انسانوں کو پیدا کرنا دشوار نہیں ہے، اس کے لیے یہ بات آخر کیوں دشوار ہوگی کہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کر کے اپنے سامنے حاضر کرے اور اُن کا حساب لے؟

إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ۝ فَأْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ أَهْلَكْنٰهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ أَجْمَعِيْنَ (الدخان ۔ ۳۴ تا ۴۰)

یہ لوگ کہتے ہیں "ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں، اس کے بعد ہم دوبارہ اُٹھائے جانے والے نہیں، اگر تم سچے ہو تو اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو"۔ یہ بہتر ہیں یا تُبَّع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے اُن کو اس بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے۔ یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ان سب کے اُٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے۔

کفار کا کہنا یہ تھا کہ پہلی دفعہ جب ہم مریں گے تو بس فنا ہو جائیں گے، اس کے بعد پھر کوئی زندگی نہیں ہے۔ "پہلی موت" کے الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کے بعد کوئی دوسری موت بھی ہو۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو اس قول کے صادق ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کے بعد لازماً دوسرا بچہ ہو، بلکہ صرف یہ کافی ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی بچہ نہ ہوا ہو۔ اس لیے کفار "پہلی موت" کا لفظ اس معنی میں استعمال نہیں کرتے تھے کہ اس کے بعد دوسری کوئی زندگی اور پھر کوئی دوسری موت ہو۔ بلکہ وہ پہلی موت کو جو اس دنیا میں آتی ہے ایک ہی اور آخری موت سمجھتے تھے۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ ہم نے کبھی مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ جی اُٹھتے نہیں دیکھا ہے، اس لیے ہم یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی۔

تم لوگ اگر دعویٰ کرتے ہو کہ دوسری زندگی ہوگی تو ہمارے اجداد کو قبروں سے اُٹھالاؤ تاکہ ہمیں زندگی بعدِ موت کا یقین آجائے۔ یہ کام تم نے نہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تمہارا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ یہ گویا اُن کے نزدیک حیات بعد الموت کی تردید میں بڑی پختہ دلیل تھی، حالانکہ سراسر مہمل تھی۔ آخر اُن سے یہ کہا کس نے تھا کہ مرنے والے دوبارہ زندہ ہو کر اسی دنیا میں واپس آئیں گے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی مسلمان نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ ہم مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں؟

اُن کے اعتراض کا پہلا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ تُبّع[1] اور اس سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں سے کچھ بہتر تو نہیں ہیں۔ اُن کو ہم نے اُن کے جرائم ہی کی وجہ سے تو ہلاک کیا تھا۔ اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ انکارِ آخرت وہ چیز ہے جو کسی شخص، گروہ یا قوم کو مجرم بنائے بغیر نہیں رہتی۔ اخلاق کی خرابی اس کا لازمی نتیجہ ہے اور تاریخ انسانی شاہد ہے کہ زندگی کے اس نظریے کو جس قوم نے بھی اختیار کیا ہے وہ آخر کار تباہ ہو کر رہی ہے۔ رہا یہ سوال کہ "یہ بہتر ہیں یا تُبّع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟" اس کا مطلب یہ ہے کہ کفارِ مکہ تو اس خوشحالی اور شوکت و حشمت کو پہنچ بھی نہیں سکے ہیں جو تُبّع کی قوم، اور اس سے پہلے سبا اور قومِ فرعون اور دوسری قوموں کو حاصل رہی ہے۔ مگر یہ مادی خوشحالی اور دنیوی شان و شوکت اخلاقی زوال کے نتائج سے اُن کو کب بچا سکی تھی کہ یہ اپنی ذرا سی پونجی اور اپنے ذرائع و وسائل کے بل بوتے پر ان سے بچ جائیں گے۔

اُن کے اعتراض کا دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جو شخص بھی حیات بعد الموت اور آخرت کی جزا و سزا کا منکر ہے وہ دراصل اس کارخانۂ عالم کو کھلونا اور اس کے خالق کو نادان بچہ سمجھتا ہے۔ اسی بنا پر اُس نے یہ رائے قائم کی ہے کہ انسان دنیا میں ہر طرح کے ہنگامے برپا کر کے ایک روز بس یونہی مٹی میں رَل مِل جائے گا اور اس کے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ حالانکہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کی نہیں بلکہ ایک خالقِ حکیم کی بنائی ہوئی ہے، اور کسی حکیم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ فعلِ عبث کا ارتکاب کرے گا۔ انکارِ آخرت کے جواب میں یہ استدلال قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔

رہا اُن کا یہ مطالبہ کہ "اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو" اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ زندگی بعدِ موت کوئی تماشا تو نہیں ہے کہ جہاں کوئی اس سے انکار کرے، فوراً ایک مُردہ قبرستان سے اُٹھا کر اس کے

---

[1] تُبّع: قبیلۂ حمیر کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ ۱۱۵ قبل مسیح میں اُن کو یمن پر اقتدار حاصل ہوا اور ۳۰۰ء تک یہ وہاں حکمران رہے۔

سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اِس کے لیے تو ربّ العالمین نے ایک وقت مقرّر کر دیا ہے جب تمام اوّلین و آخرین کو وہ دوبارہ زندہ کر کے اپنی عدالت میں جمع کرے گا اور ان کے مقدمات کا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ تم مانو چاہے نہ مانو، یہ کام بہرحال اپنے وقت مقرر پر ہی ہو گا۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کیونکہ اِس طرح قبل از وقت خبردار ہو کر اُس عدالت سے کامیاب نکلنے کی تیاری کر سکو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، کیونکہ اپنی ساری عمر اِس غلط فہمی میں کھپا دو گے کہ بُرائی اور بھلائی جو کچھ بھی ہے بس اِسی دنیا کی زندگی تک ہے، مرنے کے بعد پھر کوئی عدالت نہیں ہونی ہے جس میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا کوئی مستقل نتیجہ نکلنا ہو۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا	کیا وہ لوگ جنہوں نے بُرائیوں کا ارتکاب کیا ہے
السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ	یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم اُنہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً	عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ اُن کا جینا اور
مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا	مرنا یکساں ہو جائے؟ بہت بُرے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔
يَحْكُمُوْنَ ۝ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ	اللہ نے تو آسمان اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس
وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ	لیے کیا ہے کہ ہر متنفّس کو اُس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔
نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝	لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔

(الجاثیہ - ۲۱-۲۲)

یہ آخرت کے برحق ہونے پر اخلاقی استدلال ہے۔ اخلاق میں خیر و شر اور اعمال میں نیکی و بدی کے فرق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اچھے اور بُرے لوگوں کا انجام یکساں نہ ہو، بلکہ اچھوں کو ان کی اچھائی کا اچھا بدلہ ملے اور بُرے اپنی بُرائی کا بُرا بدلہ پائیں۔ یہ بات اگر نہ ہو، اور نیکی و بدی کا نتیجہ ایک ہی جیسا ہو تو سرے سے اخلاق میں خوبی و زشتی کی تمیز ہی بے معنی ہو جاتی ہے اور خدا پر بے انصافی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ جو لوگ دنیا میں بدی کی راہ پر چلتے ہیں وہ تو ضرور یہ چاہتے ہیں کہ کوئی جزا و سزا نہ ہو، کیونکہ یہ تصور ہی ان کے عیش کو مُنَغّص کر دینے والا ہے۔ لیکن خداوندِ عالم کی حکمت اور اس کے عدل سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ نیک و بد سے ایک جیسا معاملہ کرے اور کچھ نہ دیکھے کہ مومنِ صالح نے دنیا میں کس طرح زندگی بسر کی ہے اور کافر و فاسق یہاں کیا گل کھلاتا رہا ہے۔ ایک شخص عمر بھر اپنے اُوپر اخلاق کی پابندیاں لگائے رہا۔ حق والوں کے حق ادا کرتا رہا۔ ناجائز فائدوں اور لذّتوں سے اپنے آپ کو محروم کیے رہا۔ اور حق و صداقت کی خاطر طرح طرح کے نقصانات برداشت کرتا رہا۔ دوسرے

شخص نے اپنی خواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کیں۔ نہ خدا کا حق پہچانا اور نہ بندوں کے حقوق پر دست درازی کرنے سے باز آیا۔ جس طرح سے بھی اپنے لیے فائدے اور لذتیں سمیٹ سکتا تھا، سمیٹتا چلا گیا۔ کیا خدا سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ ان دونوں قسم کے آدمیوں کی زندگی کے اس فرق کو وہ نظر انداز کر دے گا؟ مرتے دم تک جن کا جینا یکساں نہیں رہا ہے، موت کے بعد اگر ان کا انجام یکساں ہو تو خدا کی خدائی میں اس سے بڑھ کر اور کیا بے انصافی ہو سکتی ہے؟

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق کھیل کے طور پر نہیں کی ہے بلکہ یہ ایک بامقصد حکیمانہ نظام ہے۔ اس نظام میں یہ بات بالکل ناقابلِ تصور ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے اختیارات اور ذرائع و وسائل کو صحیح طریقہ سے استعمال کر کے جن لوگوں نے اچھا کارنامہ انجام دیا ہو، اور انھیں غلط طریقہ سے استعمال کر کے جن دوسرے لوگوں نے ظلم و فساد برپا کیا ہو، یہ دونوں قسم کے انسان آخر کار مر کر مٹی ہو جائیں اور اس موت کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ ہو جس میں انصاف کے مطابق ان کے اچھے اور بُرے اعمال کا کوئی اچھا یا بُرا نتیجہ نکلے۔ اگر ایسا ہو تو یہ کائنات ایک کھلنڈرے کا کھلونا ہو گی نہ کہ ایک حکیم کا بنایا ہوا بامقصد نظام۔

آخرت کا انکار دراصل وہی لوگ کرتے ہیں جو خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنا چاہتے ہیں اور عقیدۂ آخرت کو اپنی اِس آزادی میں مانع سمجھتے ہیں۔ پھر جب وہ آخرت کا انکار کر دیتے ہیں تو اُن کی بندگیِ نفس اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور وہ اپنی گمراہی میں روز بروز زیادہ ہی بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی بُرائی ایسی نہیں ہوتی جس کے ارتکاب سے وہ باز رہ جائیں۔ کسی کا حق مارنے میں انھیں تامل نہیں ہوتا۔ کسی ظلم اور زیادتی کا موقع پا جانے کے بعد ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سے صرف اس لیے رُک جائیں گے کہ حق و انصاف کا کوئی احترام اُن کے دلوں میں ہے۔ جن واقعات کو دیکھ کر کوئی انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے، وہی ان کی آنکھوں کے سامنے بھی آتے ہیں، مگر وہ اُن سے اُلٹا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں اور ہمیں یہی کچھ کرنا چاہیے۔ کوئی کلمۂ نصیحت ان پر کارگر نہیں ہوتا۔ جو دلیل بھی کسی انسان کو بُرائی سے روکنے کے لیے مفید ہو سکتی ہے، وہ ان کے دل کو اپیل نہیں کرتی، بلکہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ساری دلیلیں اپنی اِس بے قید آزادی کے حق میں نکالتے چلے جاتے ہیں، اور ان کے دل و دماغ کسی اچھی فکر کے بجائے شب و روز اپنی اغراض و خواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کرنے کی اُدھیڑبُن ہی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ عقیدۂ آخرت کا انکار انسانی اخلاق کے لیے تباہ کن ہے۔ آدمی کو آدمیت کے دائرے میں اگر کوئی چیز رکھ سکتی ہے تو وہ صرف یہ احساس ہے کہ ہم

غیر ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ ہمیں خدا کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ اس احساس سے خالی ہو جانے کے بعد کوئی شخص بڑے سے بڑا عالم بھی ہو تو وہ جانوروں سے بدتر رویہ اختیار کیے بغیر نہیں رہتا۔

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ. مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ۝ سَلْهُمْ أَيُّهُمْ بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ۝ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ ۚ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ۝ (القلم - ۳۵ تا ۴۱)	کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر کیا تمہارے لیے روزِ قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ؟ ان سے پوچھو تم میں سے کون اس کا ضامن ہے؟ یا پھر کیا ان کے ٹھیرائے ہوئے کچھ شریک ہیں (جنہوں نے اس کا ذمہ لیا ہو؟) یہ بات ہے تو لائیں اپنے شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں۔

مکہ کے سردار مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم کو جو نعمتیں دنیا میں مل رہی ہیں یہ ہمارے مقبولِ خدا ہونے کی علامت ہیں، اور تم جس بدحالی میں مبتلا ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم خدا کے مغضوب ہو۔ لہٰذا اگر کوئی آخرت ہوئی بھی جیسا کہ تم کہتے ہو تو وہاں بھی ہم مزے کریں گے اور عذاب تم پر ہوگا نہ کہ ہم پر۔ اس پر فرمایا گیا کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ خدا فرمانبردار اور مجرم میں تمیز نہ کرے۔ تمہاری سمجھ میں آخر کیسے یہ بات آتی ہے کہ کائنات کا خالق کوئی اندھا راجہ ہے جو یہ نہیں دیکھے گا کہ کن لوگوں نے دنیا میں اس کے احکام کی اطاعت کی اور بُرے کاموں سے پرہیز کیا، اور کون لوگ تھے جو اُس سے بے خوف ہو کر ہر طرح کے گناہ اور جرائم اور ظلم و ستم کرتے رہے؟ تم نے ایمان لانے والوں کی خستہ حالی اور اپنی خوشحالی تو دیکھ لی۔ مگر اپنے اور اُن کے اخلاق و اعمال کا فرق نہیں دیکھا اور بے تکلف حکم لگا دیا کہ خدا کے ہاں فرمانبرداروں کے ساتھ تو مجرموں کا سا معاملہ کیا جائے گا، اور تم جیسے مجرموں کو جنت عطا کر دی جائے گی۔ یہ حکم آخر تم نے کس بنا پر لگایا ہے؟ کیا تمہارے پاس خدا کی کوئی کتاب ہے جس میں یہ لکھا ہو؟ یا خدا سے تمہارا کوئی عہد و پیمان ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو تم میں سے کون آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اللہ سے تمہارے لیے ایسا کوئی عہد و پیمان لے رکھا ہے؟ اور اگر تمہارے معبودوں میں سے کسی نے یہ کہا ہے تو بلاؤ اُن کو اور پوچھو کہ

ان میں سے کس نے خدا سے یہ وعدہ لے لیا ہے۔ غرض تم اپنے حق میں جو حکم لگا رہے ہو اس کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ خدا کی کسی کتاب میں بھی تم یہ لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے۔ تم میں سے کوئی یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ اس نے خدا سے ایسا کوئی عہد لے لیا ہے۔ اور جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں سے بھی کسی سے تم یہ شہادت نہیں دلوا سکتے کہ خدا کے ہاں تمہیں جنت دلوا دینے کا وہ ذمّہ لیتا ہے۔ پھر یہ غلط فہمی آخر تمہیں کہاں سے لاحق ہو گئی؟

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ۔ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (التکویر۔ ۸-۹)

اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟

اِس آیت کے اندازِ بیان میں ایسی شدید غضبناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضبناکی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابلِ نفرت ہوں گے کہ اُن کو مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اِس معصوم کو کیوں قتل کیا؟ بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ تو بے چاری آخر کس قصور میں ماری گئی؟ اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے زندہ دفن کر دیا۔ اس کے علاوہ اِس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ دیے گئے ہیں جو الفاظ میں بیان کیے بغیر خود بخود اس کے فحویٰ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اہلِ عرب کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جاہلیّت نے ان کو اخلاقی پستی کی کس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں زندہ درگور کرتے ہیں، پھر بھی انہیں اصرار ہے کہ اپنی اِسی جاہلیت پر قائم رہیں گے اور اُس اصلاح کو قبول نہ کریں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بگڑے ہوئے معاشرے میں کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں آخرت کے ضروری ہونے کی ایک صریح دلیل پیش کی گئی ہے۔ جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا ہے، آخر اس کی کہیں تو دادرسی ہونی چاہیے، اور جن ظالموں نے یہ ظلم کیا، آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہیے جب اُن سے اِس بے دردانہ ظلم کی بازپرس کی جائے۔ دفن ہونے والی لڑکی کی فریاد دنیا میں تو کوئی سننے والا نہ تھا۔ جاہلیت کے معاشرے میں اِس فعل کو بالکل جائز کر رکھا گیا تھا۔ نہ ماں باپ کو اس پر شرم آتی تھی۔ نہ خاندان میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا تھا۔ نہ معاشرے میں کوئی اس پر گرفت کرنے والا تھا۔ پھر کیا خدا کی خدائی میں یہ ظلمِ عظیم بالکل ہی بے داد رہ جانا چاہیے؟

(باقی)

تحریک اور جمود

سید اسعد گیلانی

(۳)

افسوس ہے کہ میرے اس مضمون کی پچھلی قسط میں (صفحہ ۳۲ پر) بربنائے تسامح یہ درج ہو گیا ہے کہ "جنگ اُحُد میں مشہور صحابیہ خنساءؓ اپنے چاروں بیٹوں سمیت شریک ہوئیں"۔ یہ جنگ احد کا نہیں بلکہ جنگ قادسیہ کا واقعہ ہے جو ۱۶ھ میں ہوئی تھی۔ قارئین سے معذرت کے ساتھ درخواست ہے کہ وہ اس مقام کی تصحیح فرما لیں۔

اسعد گیلانی

کسی تحریک میں جمود پیدا ہونے چلے جانے کے اسباب صرف اخلاقی اور اصولی ہی نہیں ہوتے بلکہ تنظیمی اور اجتماعی بھی ہوتے ہیں۔ ان اسباب کے پیدا ہونے اور بڑھتے چلے جانے سے بھی جمود پیدا ہوتا اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔

تحریک میں مثالی کرداروں کی کمی

کسی تحریک کی دعوت کا فہم حاصل کر کے ہی لوگ اس میں داخل ہوتے ہیں، لیکن ہر داخل ہونے والے میں فہم اور جذبہ دونوں چیزیں یکساں نہیں ہوتیں۔ نہ ان پر تحریک کی دعوت کا اثر اور عمل یکساں ہوتا ہے اور نہ ان میں اس کا ردّ عمل ہی یکساں ہوا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ان میں تحریک اور اس کی دعوت کے لیے سرگرمی، لگن اور ایثار و قربانی کے جذبات بھی یکساں نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ آہستہ آہستہ نصب العین کی منزل کی طرف رواں ہوتے ہیں، کچھ تیز تیز چلتے ہیں، اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی ساری توجہات اور محنتوں کا مرکز اور اپنی ساری قوتوں اور صلاحیتوں کا محور اسی کو بنا لیتے ہیں اور اپنی خداداد استعداد و انہماک اور فہم و عمل کی یکسوئی سے نصب العین کے راستے پر بہت دُور آگے نکل جاتے ہیں۔ اسلامی تحریک میں اِنہی

غیر یکساں ایمانی کیفیات کو ایمان کے تین مدارج میں بیان کیا گیا ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ (بخاری)

(ترجمہ۔ اگر کوئی کسی بُرائی کو دیکھے تو اُسے ہاتھ سے روک دے۔ اور اگر یہ اس کے بس سے باہر ہو تو زبان سے اس کی مذمت کرے۔ اور اگر یہ بھی اس کے بس سے باہر ہو تو دل میں اُسے بُرا سمجھے، اور یہ ایمان کی کمزور ترین صورت ہے)۔

دوسری جگہ فرمایا کہ اس سے نیچے اتنا ایمان بھی نہیں ہے جتنی اُڑد پر سفیدی ہوتی ہے۔

گویا نظامِ باطل کے خلاف لڑنے والی داخلی قوت ___ ایمان ___ کو تین درجوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ایمان کی وہ قوت جو بُرائی کے وجود کو قطعاً برداشت نہیں کرتی اور اسے بزورِ بازو مٹا دینے کا داعیہ رکھتی ہے، درجۂ اوّل کی مطلوب قوت ہے۔ یہی قوت باطل کے خلاف اپنا جہادِ موت وزیست گرم رکھتی ہے۔ یہی قوت رکھنے والے کارکنوں سے باطل کے خلاف جد وجہد کرنے والی تحریکِ اسلامی کی صفِ اوّل مرتب ہوتی ہے۔ دعوت کو سُننے اور قبول کرنے کے بعد ایمان کی دوسرے درجے کی قوت وہ ہوتی ہے جو باطل کو دیکھ کر اس سے لڑ جانے اور بزورِ بازو اسے مٹا دینے کی ہمت تو نہیں رکھتی، لیکن اس کے خلاف زبان کا جہاد ضرور کرتی ہے۔ یہ بھی ایک اہم کام ہے۔ چنانچہ سلطانِ جابر و ظالم کے خلاف اس قوت کے استعمال کو بھی جہادِ کبیر کہا گیا ہے۔ یہ قوت بھی مطلوب و محبوب ہے اور اس سے اسلامی تحریک کی وہ صف تیار ہوتی ہے جو ہمیشہ دعوت کو سربلند رکھتی ہے اور صفِ اوّل میں پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرتی رہتی ہے۔ اس کے بعد ایمان کا وہ تیسرا درجہ ہے جس میں انسان کا ضمیر بیدار رہتا ہے۔ باطل کی قہرمانی پر اس کا دماغ سوچتا ہے، دل کڑھتا ہے، ضمیر روتا ہے اور سینہ جلتا ہے، لیکن

ع لبوں پر مُہرِ خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں

کے مصداق دعوتِ حق نہ عمل بن کر ہاتھ اور پاؤں سے ظاہر ہوتی ہے اور نہ قول بن کر لبوں پر آتی ہے۔ بس کُڑھن اور چُبھن بن کر دل کی پھانس بنی ہوئی سینے کو جلاتی اور خون کو کھولاتی رہتی ہے۔ یہ ایک کمزور اور نحیف و نزار سسکتے ہوئے ایمان کی علامت ہے جو سہولت ہو تو چار قدم چل لیتا ہے اور دشواری ہو تو ٹھٹھک کر کھڑا رہ جاتا ہے۔ جسے ظاہری طور پر پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ ایسے ایمان والے کارکن کو اگر شبہہ ہو کہ باطل اور اس کے کارندوں کو اس پر تحریکِ اسلامی کا ہمدرد ہونے کا گمان ہے، تو وہ اپنے اُوپر بے خبری، بے نیازی، لاتعلقی اور عدمِ دلچسپی

کے کئی کئی لبادے یکے بعد دیگرے اوڑھ لیتا ہے اور صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ اس کا کسی دعوت و تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے نزدیک تحریک سے تعلق کا مفہوم صرف ذہنی وابستگی ہوتا ہے اور اس طرح تحریک کے لیے اس کے وجود کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

تحریک کی قوت کے مختلف دائرے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کی حقیقی قوت وہی لوگ ہوتے ہیں جو صفِ اوّل میں کھڑے ہو کر نظامِ باطل سے براہِ راست پنجہ کشی کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے اندر بھی نظم کے پابند کارکنوں اور دل و جان کے کارکنوں کا فرق موجود ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک کے محسنین، یعنی دل و جان کے کارکنوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ دل و جان کے کارکن ہی تحریک کے انجن کا کام دیتے ہیں اور اُنھی کے کردار اپنے دوسرے ساتھیوں کے لیے نمونے کے مثالی کردار ہوتے ہیں۔ اُنھی کی قربانیاں تاریخ میں بیان کی جاتی اور منبر و محراب اور جلسوں اور پلیٹ فارموں سے دُہرائی جاتی ہیں۔ اُنھی کے کارناموں کے بیان سے سرد خون گرم ہوتے ہیں۔ ٹھنڈے جذبات جوش میں آتے ہیں، بند جیبیں انفاق کے لیے کھلتی ہیں اور اُنھی کا طرزِ عمل تحریک کی منجمد فضا میں گرمی اور تیز روی کا خون دوڑاتا ہے۔ دنیا کی عظیم ترین اسلامی تحریک کے قائدؐ فرماتے ہیں: مجھے ہجرت کا حکم ہو گیا ہے، میرے پاس لوگوں کی جو امانتیں محفوظ ہیں انھیں واپس کرنے کے لیے میرے پیچھے کون میری جگہ میرے بستر پہ آج کی رات سوئے گا؟ وہ بستر جس پر قریش کے شمشیر زن اُس رات تلواریں برسانے والے تھے۔ ایک نوجوان موت کے بستر پہ اُس رات سونے کے لیے بے دھڑک تیار ہو جاتا ہے۔ وہ بستر اس رات تاریخِ عزیمت کا بستر تھا۔ وہ نوجوان کہتا ہے کہ اتنی ٹھنڈی اور میٹھی نیند تو مجھے اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی جو اس رات آئی۔ اس کی یہ بات تاریخ کے سینے پر ثبت ہو جاتی ہے۔ وہ کردار تاریخ کا سہرا بن جاتا ہے، وہ کردار مثالی بن جاتا ہے۔ آج ہم کسی اسلامی تحریک کے اندر بڑھتی ہوئی سردی اور انجماد کو اس کردار کی دی ہوئی گرمی سے دُور کر سکتے ہیں۔

اسلامی تحریک کے قائدؐ کفار کے خلاف لشکر مرتب کر رہے ہیں، کفر و اسلام کا بہت بڑا فیصلہ کن معرکہ سلطنتِ روم کی سرحد پہ برپا ہونے والا ہے۔ تحریک کی طرف سے ایثار و قربانی کا ہر کسی سے مطالبہ ہے۔ لوگ اپنے اپنے مال لیے چلے آرہے ہیں۔ حسبِ حیثیت، حسبِ جذبہ و توفیق، کوئی آدھا گھر اُٹھا لایا ہے اور کسی نے پورا گھر سمیٹ کر خدا کے لیے تحریک کے دامن میں لا ڈالا ہے اور اس سوال پر کہ اپنے لیے کیا رکھا ہے یہ جواب

ملتا ہے کہ

پروانے کو چراغ تو بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

یہ جواب تاریخ کا سرمایہ بن جاتا ہے۔ دوسروں کے لیے عمدہ مثال بن جاتا ہے۔

ایک صاحب جھینپتے شرماتے دامن میں کوئی شے ڈالے چلے آرہے ہیں، تحریک کے عظیم مقصد اور درپیش معرکے میں مالی امداد کے لیے رات بھر رہٹ چلا کر مزدوری کی ہے، اب ہاتھوں کے چھالے چھپاتے دامن میں تھوڑی سی کھجوریں ڈال کر تحریک کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ اتنے بڑے مال کے ڈھیر کے سامنے کھجوروں کے چند دانے کیا حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان دانوں کی اوٹ میں ایثار و قربانی کا جذبہ اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ بلند ہے جو ہر کسی کو نظر آئے یا نہ آئے، لیکن تحریک کے قائدؐ کو تو صاف نظر آرہا ہے اور وہ چھوہارے سارے ڈھیر پر حاصل ایثار قرار دے کر بکھیر دیے جاتے ہیں۔ وہ شخص بھی تاریخ کا مثالی کردار بن جاتا ہے۔

ان مثالی کرداروں سے صدیوں بعد تک لوگ عزیمت و استقامت، جذبہ و توانائی اور حرکت و قوت کا سبق سیکھتے ہیں۔ ایک صاحب تحریک کے لیے اپنے کافر والد سے تلوار لے کر اُلجھ پڑتے ہیں۔ ایک صاحب تلوار لے کر اپنے کافر بیٹے کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ایک صاحب اپنا سارا مال و متاع راہِ حق میں لُٹا کر اور دامن جھاڑ کر سفرِ ہجرت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک صاحب جو ریشم و کمخواب میں کھیلتے تھے اب جسم پر بوریہ لپیٹے پھرتے ہیں۔ ایک خاتون اپنے جگر پاروں کی شہادت پر شکرِ خدا بجا لا رہی ہیں کہ وہ اللہ کے راستے میں کام آئے اور وہ شہیدوں کی ماں بن گئی۔ ایک صاحب گلیوں میں اذانِ دعوتِ حق بلند کرنے کے جرم میں پتھروں سے زخمی کیے جا رہے ہیں۔ یہ عین کشمکشِ حق و باطل کی منجدھار میں جان ہتھیلی پہ رکھے کشمکش کرنے والے اور تخت یا تختہ کا نعرہ لگا کر زندگیوں کو ہتھیلی پر رکھے محوِ جہاد مثالی لوگ ہیں۔ یہ تاریخی کردار ہیں۔ یہ مثالی کردار ہیں۔ ان کو دیکھ کر تاریخ میں جان پیدا ہوتی ہے۔ ان کے وجود سے دنیا میں نصب العین سے عشق کا معیار قائم ہوتا ہے اور اس کی محبت کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ ان کی کوشش اور مرضی سے تاریخ اپنا دھارا بدلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ تاریخِ انسانیت کا خزانہ، اس کا جوہر، اس کا مکھن اور اس کا سرسبز اثاثہ ہوتے ہیں۔

ایسے لوگ بہت ہوں تو تحریک کی رفتار تیز تر اور اس کی قوتِ جہاد برق کی مانند تیغِ بُرّاں ہوتی ہے۔ یہ لوگ مناسب حد تک ہوں تو تحریک اپنی فطری رفتار سے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ یہ لوگ کم ہو جائیں تو تحریک

اُونگھنے لگتی ہے اور اس کی رگوں کا خون منجمد ہونے لگتا ہے۔ یہ لوگ مفقود ہو جائیں تو تحریک کو اضمحلال و انحطاط سے اور اس کی صفوں کو جمود و انجماد سے کوئی شے نہیں بچا سکتی۔ ایسے لوگ تحریک کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔ اس کی رگوں کا خونِ حیات ہوتے ہیں۔ انہیں ضائع کر دینا یا انہیں پیچھے پھینک کر بے ضمیر یا ضعیف الایمان لوگوں کو آگے لانا، جیسا کہ اسلامی تاریخ کے دَورِ ملوکیت میں ہوا، تحریک کا بہت بڑا نقصان ہوتا ہے اور جو تحریک ایسے لوگوں سے بے نیاز ہو جاتی ہے تاریخ ایسی تحریک سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ غرض ہر باشعور اور مخلص تحریک کی تاریخ ایسے لوگوں کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ وہ لوگ آئیں تو تحریک آگے بڑھتی ہے اور اگر وہ نہ آئیں تو تحریک نشانِ عبرت بن کر تاریخ کا غبار بن جاتی ہے۔

یکساں حرکت، علامت جمود

تحریکوں کے لیے یکساں لگے بندھے پروگرام پر مسلسل اور پیہم چلتے رہنا، رفتارِ کار میں اضافے کا کوئی خصوصی اہتمام نہ کرنا، نصب العین تک پہنچنے کے لیے حدودِ کار میں رہتے ہوئے مختلف النوع تدابیر اختیار نہ کرنا، مُہمّات کے ذریعے کارکنوں کو فعال و بیدار و مستعد رکھنے کی کوشش نہ کرنا اور انہیں ایک ہی رفتار سے چلاتے چلے جانا، حرکت کا اس نوعیت کا یکساں تسلسل بھی بذاتِ خود جمود کا باعث بن جاتا ہے۔ سائنس بھی حرکت کے اس یکساں تسلسل کو علامتِ جمود ہی قرار دیتی ہے۔ اجرامِ فلکی اپنی رفتار کی اس یکسانی کے باعث ہی تیز رفتاری کے باوجود ٹھہرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسی حرکت نتیجہ خیز ہونے کی بجائے بتدریج خود مقصد بن کر رہ جاتی ہے اور رفتارِ کار بڑھانے کے منصوبے بھی کارکنوں کو تیز تر کرنے سے قاصر رہتے اور مقصدِ جمود و انحطاط کو ہی پورا کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ تحریک کو اسی انداز اور اسی رفتار سے لیے چلنا اور اسی انداز سے اُسے قائم رکھنا ہی مقصود بالذات بن جاتا ہے۔ جب یہ صورت بن جاتی ہے تو اس رفتار کا قائم رکھنا بھی درحقیقت ممکن نہیں رہتا، اور مُہمّاتی انداز میں خصوصی جدوجہد کر کے رفتار کو تیز تر نہ کرنے کا نتیجہ رفتار کی کمی کی صورت میں نکلنے لگتا ہے اور جب کوئی گاڑی ایک دفعہ ایک خاص رفتار قائم کر لیتی ہے تو پھر وہ ٹھہراؤ کی سمت مسلسل حرکت کرنے لگتی ہے۔ اس کے بعد اس کے بتدریج ٹھہرتے چلے جانے اور بالآخر ایک نقطۂ سکون پر پہنچ جانے کو معمول کی کارگزاریاں نہیں تھام سکتیں جب تک خصوصی کوشش کر کے حرکت کو جھٹکوں (JERKS) اور مہمات کے ذریعے بڑھانے کا خصوصی اہتمام نہ کیا جائے۔ خصوصی تدابیر سے بڑھائی ہوئی حرکت ہی دیکھنے والوں کو متاثر کرتی اور اس کے ساتھ حرکت کرنے والوں کو مطمئن کرتی ہے ورنہ مسلسل ساتھ چلنے والے بھی مطلوبہ نتائج سے دُوری کے تصوّر سے چلنے کی بجائے گھسٹنے لگتے ہیں اور تحریک جمود کا شکار ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہ بات ہر تحریک کے چلانے والوں کی اپنی بصیرت پر مبنی ہوتی ہے کہ وہ تحریک کو فعال و بیدار رکھنے کے لیے نئے سے نئے پروگرام بنائیں۔ اسے نئی سے نئی حرکت دیں۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے فاصلے کو چھوٹی چھوٹی مسافتوں میں تقسیم کریں اور ان مسافتوں کو طے کرنے کے لیے تحریک کے سامنے چھوٹی چھوٹی مُہمات رکھیں۔ تحریک میں پروگراموں کی اُس یکسانی کو بار بار رفع کریں جو جمود بن سکتی ہو۔ تحریک کے اصولی کردار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے اجتماعی ڈھانچے کو مختلف ذرائع سے حرکت میں رکھیں۔ اس امر کا امتیاز قائم رکھیں کہ تحریکوں کے معمول کے داخلی پروگرام ہی ان کے حقیقی پروگرام نہ بن کر رہ جائیں۔ جیسے کھانا جسم کی نشوونما کے لیے تو ضروری ہے لیکن خود جسم کسی اور مقصد کے لیے ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کھانا جسم کے لیے اور جسم کھانے کے لیے مختص ہو کر ایک دائرے کی گردشِ لیل و نہار میں بندھ جائیں اور پھر جسم کسی منزل تک نہ پہنچ سکے اور اپنی ہی گردش میں گم ہو کر رہ جائے۔

اس نوعیت کی مثال کے لیے ہمیں دنیا کی ہر اجتماعی جدوجہد میں نظیریں مل سکتی ہیں، لیکن انہیں چھوڑ کر ہم خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی دعوت و تحریک پر نظر ڈالیں تو ہمیں وہاں اس کی نہایت عمدہ مثالیں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً تین سال کی خفیہ دعوت کو ترک کر کے اچانک پورے شہر کے لوگوں کو جمع کرنا اور ان کے سامنے ایک خاص انداز میں دعوت پیش کرنا ایک بہت بڑی پیش قدمی تھی۔ پھر کچھ عرصے بعد ایک پروگرام کے تحت دعوت کے کارکنوں کی ایک بڑی تعداد کا گھر بار چھوڑ کر حبشہ کے پردیس کی طرف ہجرت کر جانا اور گھر گھر میں اور دُور و نزدیک میں اس بات کا چرچا پھیل جانا ایک اور پیش قدمی تھی۔ پھر معراج کے واقعہ کا چرچا اور مجالس میں ہاؤ ہو اور ہنگامے بھی ایک اور بڑی ضرب تھی۔ پھر پوری جماعت کا ایک مورچہ چھوڑ کر دوسرے مورچے پر چلے جانا اور دشمنوں کے لیے محاذ آرائی کی سی کیفیت پیدا کر دینا تو ایک زبردست انقلابی اقدام تھا۔ پھر تجارتی قافلہ کو جو نرم چارہ تھا، چھوڑ کر فوجی کارروائی کا راستہ اختیار کرنا تحریک کے لیے شجاعت و بہادری کا عظیم مثالی کارنامہ تھا۔ اسی طرح شہر کے اندر رہ کر مقابلے کے بجائے کھلے میدان میں زور آزمائی کا فیصلہ بھی اظہارِ قوت کا عمدہ مظاہرہ تھا۔ اور پھر سارے عرب کے اُمنڈ آنے پر احزاب کے درمیان پھوٹ ڈلوانے کی کامیاب تدابیر بھی حکمتِ کار کا نمونہ ثابت ہوئیں۔ غرض اُس تحریک کی ۲۳ سالہ جدوجہد میں ہم مختلف مواقع پر ایسی ایسی تدابیر کو بروئے کار آتے دیکھتے ہیں جو پوری جماعت کو چوکنا، بیدار، مستعد، چاق چوبند اور جان فروش بنانے کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی تھیں۔ تحریک کے دورِ ثانی میں جب وہ محاذ آرائی کے مورچے پر پہنچ چکی ہے صرف نو سال کے عرصے میں تراسی (۸۳) سے زائد معرکے اور مہمات تاریخ میں درج ہیں۔ ایسے فعال گروہ میں جمود اور عدم دلچسپی

پیدا ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہاں تو حرکت اتنی تیز، کشمکش اتنی جاں گسل اور جدوجہد اتنی زوردار ہے کہ کسی کے لیے ٹھیراؤ اور جماؤ اور پڑاؤ کی کوئی مہلت ہی نہیں ہے۔ پھر تحریک کی اپنی انفرادیت اتنی بے پایاں ہے کہ اس کے بارے میں ایک طالع آزما گروہ ہونے کا دُور دُور تک گمان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سب سے منفرد، سب سے مختلف، اور سب کے لیے واضح لائحہ عمل رکھنے والا ایک جانباز گروہ ہے جسے اپنے پاؤں پر خود جدوجہد کرنی ہے اور اپنے نتائج اپنی جدوجہد سے خود برآمد کرنے ہیں۔ وہ تحریک ایک آکاس بیل کی طرح نہیں ہے جو کسی درخت کا سہارا لے کر کھڑی ہو بلکہ وہ خود تن آور درخت ہے جس کے سایے میں صحرانشین آکر دم لیتے اور قلب و ضمیر کی خنکی حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ تحریک اپنے مختلف مراحل کے اعتبار سے آگے بڑھتی ہوئی ایک ایسی سرگرم قوت ہے جو ہر دم تیز تر ہے اور اس کی پیش قدمیوں میں یکسانی اور جمود کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ سراپا حرکت ہے اور ہر حرکت کے بعد دوسری حرکت پہلی سے تیز تر ہے۔

میری رائے میں کسی تحریک کی بابصیرت قیادت کا سب سے پہلا فریضہ یہی ہوتا ہے کہ وہ تحریک کو جمود کی ڈگر پر نہ پڑنے دے۔ جس طرح کچے راستے پر چھکڑا اپنی ہی بنی ہوئی لکیر کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر اس کے لیے اس میں سے نکلنا اور اپنی رفتار بڑھانا ممکن نہیں رہتا، اسی طرح اگر کوئی تحریک اپنے ہی بنائے ہوئے روزمرّہ کے داخلی پروگرام میں محبوس ہو کر رہ جائے اور کوئی انقلابی اقدام نہ کر سکے تو اسے جمود کا شکار ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

باہمی تعلقات کی ناخوشگواری جمود کے بہت سے اسباب میں سے ایک نہایت ہی اہم سبب کارکنوں کے باہمی تعلقات کی ناخوشگواری بھی ہوتی ہے۔ مطلوب اور معیاری چیز تو یہی ہے کہ تعلقات انتہائی خوشگوار ہوں، محبت و اُلفت اور رفاقت و مودّت کا جذبہ افراد کو باہم جوڑے ہوئے ہو، اور شیطان کو دخل اندازی کا کوئی موقع میسّر نہ آئے۔ لیکن انسانوں کے درمیان یہ بھی ایک فطری صورت ہی ہے کہ ان میں باہمی غلط فہمیاں پیدا ہوجائیں، تعلقات ناخوشگوار ہوجائیں اور باہمی کھنچاؤ اور تناؤ پیدا ہوجائے۔ اس سے آگے بڑھتے ہوئے قدم رُک جاتے ہیں اور وہ قوتیں جو باطل کو گرانے اور دشمن کو زیر کرنے پر صرف ہونی چاہییں، ایک دوسرے کو گرانے، ہٹانے اور اُلجھنے میں صرف ہونے لگتی ہیں اور آگے بڑھنے کا عمل رُک کر پیچھے ہٹنے کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ اس طرح تحریک کی بہت سی قوت بکھر کر رہ جاتی ہے۔ اس سے تحریک کی ہوا اُکھڑنے لگتی ہے اس کا بھرم اور وزن کم ہونے لگتا ہے۔ اس کا رعب اور وقار گھٹنے لگتا ہے اور جو کام صرف اس کے نام کے زور سے ہوسکتے تھے اب وہ اس کے وزن اور

کوشش سے بھی ہونے مشکل ہو جاتے ہیں، اور دشمنوں کی مجلسوں میں اس کا مذاق اُڑنے لگتا ہے۔ اس کیفیت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔

(ترجمہ: اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

اور یوں بھی اللہ تعالیٰ نے اسلامی تحریک کے ساتھیوں کو باہم بھائی بھائی قرار دیا ہے۔ خود حضورؐ نے بھی مختلف مواقع پر اور مختلف پیرائے میں اسلامی تحریک کے ساتھیوں کے درمیان محبت و اُلفت کو ایمان کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ اکرم نے فرمایا:

"تم اس وقت تک مومن نہ ہو گے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے۔"

حضورؐ نے اپنی نو باتوں والی حدیث میں بھی اپنے ذاتی طرزِ عمل کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، اور جو مجھ کو حق سے محروم کرے میں اس کا حق اس کو دوں، اور جو میرے اُوپر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔"

پھر قرآن نے بھی حضورؐ کے ساتھیوں کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ:

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ

(کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں)

اِن واضح ہدایات کے باوجود انسانی فطرت کی کمزوریوں کے باعث تحریک میں نزاعات رونما ہو سکتی ہیں، کارکنوں میں ایک دوسرے کے متعلق غلط فہمیاں اور باہم بدمزگیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں، اور بسا اوقات وہ شدید صورتیں بھی اختیار کر سکتی ہیں۔ لیکن اگر کارکنوں میں بنیادی طور پر خدا ترسی و حق پرستی اور مقصدِ تحریک کے ساتھ مخلصانہ وابستگی موجود ہو، اور تحریک کے نظام میں رفع نزاعات کا انتظام بھی مؤثر طریقے سے کام کرتا رہے تو کوئی دیرپا خرابی رونما نہیں ہو سکتی اور نہ تحریک کی پیش رفت میں کوئی خلل واقع ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کارکن کبر و نخوت اور نفسانیت میں مبتلا ہوں، مقصدِ تحریک کی بہ نسبت اپنی ذات کو اوّلیت دیتے ہوں اور تنظیم میں

بھی رفع نزاعات کا کوئی مؤثر انتظام نہ ہو، نہ کارکنوں کے اندر مقصدی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے عملی اور فطری تدابیر اختیار کی جائیں، تو ناخوشگوار تعلقات میں اضافہ اور باہمی کھنچاؤ کا عمل دخل ہوتا چلا جاتا ہے جس سے تحریک کی رفتارِ کار رک جاتی ہے اور اس کی گاڑی صحیح سمت میں چلنے کی بجائے اضمحلال و انحطاط کا شکار ہو کر بعض اوقات سمتِ سفر تک بدل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نزاعات سے تحریک کو زبردست نقصان پہنچتا ہے۔

اجتماعی زندگی کے اندر انسانی تعلقات میں ناخوشگواری سے بعض اوقات اتنا بڑا نقصان نہیں پہنچتا، جتنا بڑا نقصان بگاڑ کو زندہ اور تازہ رکھنے کے رجحان اور سلجھانے والے عوامل کو بروئے کار نہ لانے سے پہنچ جاتا ہے۔ اصلاحِ ذات البین میں تاخیر اور اس سے بے رخی معاملات کو اور اُلجھا دیتی ہے۔ اس سے تعلقات کی کشیدگی کے جذباتی زخم مندمل ہونے کی بجائے اور گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں، اور تحریک کی قیادت ضابطہ بندی کا شکار ہو کر انسانی نفسیات میں مزید اُلجھاؤں کا باعث بن جاتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اگر تحریک کے کارکن بے نفسی سے اور اس کے قائدین حکمت سے بہرہ ور ہوں تو وہ نہایت آسانی سے فریقین کے ساتھ شخصی رابطہ پیدا کر کے اپنے شخصی اثرات استعمال کر کے اور اپنے تعلقات اور تحریک کی بھلائی کا واسطہ دے کے بگڑے ہوئے تعلقات کو سدھار دیتے ہیں اور کشیدگی کو خوشگواری سے بدل دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی تعلقات کو جاندار انسانی عمل سے ہی سدھارا جا سکتا ہے۔ بے جان ضابطے اور محض تنظیمی روابط انسانوں کو باندھ تو سکتے ہیں لیکن انھیں جوڑ نہیں سکتے۔ جوڑنے والی چیزیں محبت و اخوت، مدد و تعاون، دُکھ درد میں شرکت، ہمدردی، رحمدلی، ایثار و قربانی اور "دل بدست آور کہ حج اکبر است" کا وہ طرزِ عمل ہے جس میں انسانی قلب و جگر کی حرارت محسوس ہوتی ہو۔ پتھروں کو جوڑنا بلاشبہ مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ان انسانوں کو جوڑنا جو خلوصِ قلب اور بے لوثی کے ساتھ ایک نصب العین کی ڈوری سے باہم بندھے ہوئے ہوں زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اگر کسی گروہ کے افراد کی ذہنیت، اور اس کے نظم کی قیادت ساتھیوں میں باہمی تعلقات کی خوشگواری پیدا کرنے اور قائم رکھنے سے بھی قاصر ہو، اور جو زخم کہیں لگ جائے اُسے کُریدنے اور گھاؤ بڑھانے کی خصوصیت تو رکھتی ہو لیکن اسے مندمل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو تو پھر ہر نزاع ایک دُوری، اور ہر اختلاف ایک بگاڑ پر منتج ہوتا ہے اور ایسا بدنصیب گروہ بتدریج بگاڑ اور انتشار اور جمود کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔

قرآن کی بے شمار آیات اور حضورؐ اکرم کے بے شمار ارشادات اسلامی اجتماعی زندگی میں تعلقات کی درستی کی تعلیم دیتے اور تعلقات میں ناخوشگواری پیدا کرنے والے عوامل سے روکتے ہیں۔ ان تعلقات کو تباہ

کرنے والی اور سب سے بڑی بلا غیبت اور چغل خوری ہے۔ کسی کا تمسخر اُڑانا اور اس کے بارے میں غلط فہمیاں اور سوءِ ظن پھیلانا ہے۔ بہتان تراشی اور دل آزاری تعلقات کو کاٹنے والی قینچیاں ہیں۔ افواہ بازی اور اس پر یقین کر کے بلا ثبوت اُسے آگے پھیلانا ہے۔ اجتماعی زندگی میں بعض افراد کے خلاف جتھہ بندی اس اجتماعیت کو تباہ کرنے کے مترادف اور ایک بے غرض بے لوث اسلامی اجتماعیت کا تقدّس برباد کرنے والی حرکت ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلقات کو سدھارنے والی چیز باہمی ہدیوں کا تبادلہ، ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شرکت، ایک دوسرے کی عزت و آبرو کا تحفظ، محبت و خوش اخلاقی سے باہمی ملاقات اور شکایات کو رفع کرنے کا مؤثر اہتمام ہے۔ یہ نہ ہوگا تو لوگ ایک دوسرے سے بدظن اور بد دل ہو کر چھٹتے اور ایک ایک کر کے بیٹھتے چلے جائیں گے اور پوری اجتماعیت بتدریج جمود کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔

(باقی)

(بقیہ اشارات)
نہیں کیا جا سکتا اور ان کے ساتھ ساتھ وہ اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ یہ احکامِ الٰہی انسان کی پوری زندگی داخلی اور خارجی — پر محیط ہیں۔ رجعت پسند مسلمانوں کے اس غلط تصور پر چوٹ کرنے کے بعد فاضل مقالہ نگار فوراً شریعت کے ماخذ بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس سلسلے میں قرآن حکیم، سنّتِ رسولؐ، قیاس اور اجماع کی صراحت کرتے ہوئے یہ فیصلہ صادر فرماتے ہیں کہ اگر قانون کے ان چار سرچشموں کو شریعت اسلامی کے ماخذ تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس نظام کا تین چوتھائی حصہ خالص انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں قرآن حکیم کے علاوہ اسلامی شریعت کا کوئی ماخذ بھی ایسا نہیں جسے انسانی ذہن کی اختراع نہ کہا جا سکے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جسٹس صاحب حدیث نبویؐ اور سنّتِ رسولؐ کو بھی معاذ اللہ حضورؐ کی اپنی ذہنی اپج قرار دے رہے ہیں اور اسے بھی اسی مقام پر تصور کرتے ہیں جس مقام پر کہ دوسرے علماء کے اجتہادات سنّتِ رسولؐ کے بارے میں اس سے زیادہ ناسمجھی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ حضورؐ کے دیے ہوئے احکام کے متعلق تو خود اللہ تعالیٰ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وہ درحقیقت اسی کے احکام ہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى	اور وہ اپنی خواہشِ نفس سے کوئی بات نہیں کرتے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ تو وہ صرف وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔
(سورۃ النجم ۔ ۳ ۔ ۴)	

ایک دوسرے مقام پر اسی بات کی اس طرح صراحت کی گئی ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔	اور (اے نبیؐ) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔
(سورۃ النحل ۔ ۴۴)	

اس آیت کا صاف مطلب ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "الذکر" کی تبیین کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا وہ شریعتِ اسلامی کا اتنا ہی لازمی حصہ ہے جتنا کہ قرآن مجید۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے بال گوندھنے اور گوندھانے والیوں پر اور دانتوں کو کشادہ کرتے والیوں پر (تاکہ وہ کم سن معلوم ہوں) جب یہ بات بنی اسد کی ایک خاتون (جس کا نام ام یعقوب تھا اور جو قرآن مجید کی بہت زیادہ تلاوت کیا کرتی تھی) تک پہنچی تو وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں نے سنا ہے کہ تم اس طرح

کے کام کرنے والی عورتوں پر لعنت کرتے ہو تو آپ نے فرمایا: میں اس پر کیوں لعنت نہ کروں جس پر کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے اور یہ بات تو کتاب اللہ میں موجود ہے۔ اس پر وہ عورت کہنے لگی: میں نے تو پورا قرآن پڑھا ہے مگر یہ حکم میری نظر سے کہیں نہیں گزرا۔ اس پر عبداللہ بن مسعودؓ نے ارشاد فرمایا:

لئن کنتِ قرأتیه لقد وجدتیه	اگر آپ غور سے اس کا مطالعہ کرتیں تو اس حکم
قال الله عزوجل وما آتٰکم	کو کتاب الٰہی میں ضرور پا لیتیں (کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں
الرسول فخذوه وما نهٰکم	فرمایا رسولؐ جو بات بھی تمہیں بتلائیں اسے مان کر اس پر
عنه فانتهوا۔	عمل کرو اور جس بات سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

(صحیح مسلم۔ کتاب اللباس والزینۃ)

صحابہ کرامؓ سنت کی ترویج و اشاعت کو دین کے لیے کس قدر ضروری سمجھتے تھے اس کا اندازہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس خطبے سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت ارشاد فرمایا:

"الٰہی! میں تجھے ان لوگوں پر گواہ بناتا ہوں جنہیں میں نے شہروں کے نظم و نسق پر مامور کیا ہے۔ میں نے انہیں اس لیے بھیجا ہے کہ وہ انصاف کریں اور لوگوں کو دین کی باتیں بتلائیں اور اپنے نبی کی سنت سکھائیں۔"

(صحیح مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ)

ہم نے یہ چند آیات اور صحابہ کرامؓ کے دو اقوال اس لیے پیش کیے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ جسٹس صاحب سنت رسولؐ کے بارے میں جو موقف اختیار کر کے اپنے استدلال کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں وہ کتنا غلط ہے۔ حضورؐ کے ارشادات و فرمودات تو حضورؐ کے اپنے عہد سے لے کر آج تک مسلمانوں کے اندر اسی طرح مقدس، واجب التنظیم اور واجب الاطاعت تسلیم کیے جا رہے ہیں جس طرح کہ قرآن مجید کے احکام۔ یہ انکشاف دورِ جدید کے چند مجتہدین کو ہی ہوا ہے کہ سنتِ رسولؐ کی صورت میں ہمارے پاس دین کا جو بیش قیمت سرمایہ موجود ہے وہ انسانی عقل کی پیداوار ہے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ فاضل مقالہ نگار "جس مجتہد" کو اپنے اس موقف کی تائید میں بطور گواہ پیش کر رہے ہیں سنّت کے بارے میں اس کا موقف فاضل مقالہ نگار سے یکسر مختلف ہے۔ اس شخص نے سنت کی آئینی حیثیت کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے ISLAM AT THE CROSS ROADS

کے آخری باب میں اس نے اسلام کے اندر سنت کی اہمیت پر بڑی فکر انگیز بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ "عرفات" کے متعدد شماروں میں اسلامی نظام کے قیام کے ضمن میں اس نے نہایت واضح طور پر یہ بتایا ہے کہ اسلامی شریعت کے دو ماخذ الہامی ہونے کی وجہ سے دستور اسلامی کی ایسی مخصوص بنیادیں فراہم کرتے ہیں جو نا قابلِ تغیر ہیں۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ فاضل مصنف نے اس مفکر کا جو اقتباس اپنی حمایت میں نقل کیا ہے وہ سنت کے بارے میں اُن کے پیش کردہ موقف کی نہایت واضح الفاظ میں تردید کر رہا ہے۔

وہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"یہ بات اچھی طرح متعارف ہے کہ فقہ اسلامی کے سارے قوانین ان واضح نصوص پر مبنی نہیں جنہیں قرآن و سنت میں اوامر و نواہی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے فقہی احکام کا بہت بڑا حصہ استخراجی طرزِ استدلال جس میں قیاس کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہے، کا نتیجہ ہے۔ ماضی کے بلند پایہ فقہا نے قرآن و سنت سے ہی احکام مستنبط کیے اور فقہ کی تدوین جن حضرات نے کی ان کا نہ صرف قرآن و سنت کا مطالعہ نہایت گہرا تھا بلکہ انہوں نے اس کام میں بڑی جانفشانی کا ثبوت دیا۔

(اسلام میں ریاست اور حکومت کے اصول ص۱۱ از محمد اسد لیوپولڈ)

بے جا نہ ہوگا اگر ہم اس مصنف کا ایک اور اقتباس جس سے سنت کے بارے میں اس کا موقف کھل کر سامنے آتا ہے پیش کریں۔

اسلامی طرزِ زندگی۔ ذاتی ہو یا اجتماعی، کے بنیادی اصول شریعت کے اندر موجود ہیں۔ دینی اصطلاح کے مطابق شریعت کے معنی ہیں وہ سید صار استہ جسے احکام الٰہی اور احکام رسول نے متعین کیا ہے یعنی قوانینِ اسلامی۔ شارح سے اوّلاً مراد خداوند قدوس ہے اور اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے۔ خداوند تعالیٰ نے ان پر وہ کتاب نازل فرمائی جو قوانین کا سرچشمہ ہے دوسرے حامل وحی ہونے کی حیثیت سے اُن کی ذات گرامی ہی اس بات کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات پر مامور تھی کہ وہ قرآنی احکام کی تبیین کا کام سرانجام دیں اور ہمیں بتائیں کہ انہیں عملی زندگی میں کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ

نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ	اے پیغمبرؐ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تمہیں اپنی محبت سے نوازے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اللہ گناہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

ان احکام کی تبیین کے علاوہ جن کا ذکر قرآن مجید میں صاف طور پر موجود ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ فرض بھی عائد کیا گیا کہ وہ ان احکام کے ساتھ اوامر اور نواہی کی صورت میں دوسرے احکام شامل کر کے نظامِ شریعت کو مکمل کریں۔ ایک مسلمان کے لیے ان اوامر اور نواہی کی پابندی بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ ان ضابطوں کی جو ہمیں قرآن مجید سے حاصل ہوتے ہیں۔

(مجلہ عرفات انگریزی نومبر ۱۹۴۶ء)

(باقی)

دورِ جدید کے مسائل اور اُن کا اسلامی حل

سمجھنے کیلیے

عظیم لٹریچر

تفہیمات حصّہ اوّل	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۲/- روپے
〃 حصّہ دوم	〃	۲۷/- 〃
〃 حصّہ سوم	〃	۱۴/۵۰ 〃
تنقیحات	〃	۱۱/- 〃
اسلام اور ضبط ولادت	〃	۷/۲۵ 〃
تنقیدات	امین احسن اصلاحی	۷/- 〃
توضیحات	〃	۷/۷۵ 〃
اساس دین کی تعمیر	صدرالدین اصلاحی	۱۲/- 〃
اسلام اور اجتماعیت	〃	۸/- 〃
دین کا قرآنی تصوّر	〃	۵/۷۵ 〃
فریضۂ اقامت دین	〃	۷/- 〃
حقیقت عبودیّت	〃	۳ ۷۵ 〃
اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو	ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی	۱۲/۵۰ 〃
نظام اسلامی مشاہیر کی نظر میں	خلیل احمد حامدی	۶/۵۰ 〃
جہادِ اسلامی	〃	۵/۵۰ 〃

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۱۳ - ای شاہ عالم مارکیٹ - لاہور (فون نمبر ۶۸۳۴۱)

اَلْجِهَادُ فِی الْاِسْلَام

سید ابو الاعلیٰ مودودی کی اوّلین تصنیف

— جو کہ ۲۲ سال کی عمر میں تحریر کی گئی
— جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔
— جسے تحریکِ قیامِ پاکستان کے دوران مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں چھپوایا گیا۔
— اسلام کے نظریۂ جہاد اور قانونِ صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔
— دیگر مذاہب و اقوامِ عالم کے جنگی مقاصد و نظریات

اور

بین الاقوامی قوانینِ قتال کا تقابلی مطالعہ
— اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل۔
— جہاد کے مخالفین و معترضین کو مسکت جواب
درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ

چھ سو صفحات ——— قیمت:۔۔ ۲۳ روپے

ملنے کا پتہ

اِدارہ ترجمان القرآن۔ اِچھرہ۔ لاہور